ملّتِ اسلامیّہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

مُحدّث

لاہور
پاکستان

مُدیر اعلیٰ

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی

406 | ستمبر 2026ء / ربیع الاول 1448ھ

مجلس التحقيق الإسلامي

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

بیاد

مجتہد العصر حافظ عبداللہ محدّث روپڑی رحمہ اللہ

شیخ التفسیر حافظ محمد حسین روپڑی رحمہ اللہ

زیر سرپرستی

ڈاکٹر حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ
بانی و مؤسس جامعہ لاہور الاسلامیہ

مولانا حافظ عبدالوحید روپڑی حفظہ اللہ
شریک بانی جامعہ لاہور الاسلامیہ

زیر نگرانی

قاری محمد ابراہیم میر محمدی حفظہ اللہ
رئیس کلیۃ القرآن الکریم والعلوم الاسلامیہ

مولانا مفتی محمد شفیق مدنی حفظہ اللہ
رئیس کلیۃ الشریعۃ والقضاء

زیر امارت

ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ
قائمقام صدر اسلامک ویلفیئر ٹرسٹ پاکستان

ڈاکٹر حافظ حسین ازہر حفظہ اللہ
نائب صدر اسلامک ویلفیئر ٹرسٹ پاکستان

LAHORE INSTITUTE FOR SOCIAL SCIENCES

جامعہ لاہور الاسلامیہ

جَامِعَۃُ لَاہُور الِاسْلَامِیّۃ

کا انقلابی اقدام

المعهد العالي للعلوم الاجتماعية LISS

Lahore Institute For Social Sciences

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے الحاق شدہ

4 Years BS Islamic Studies + درس نظامی

Morning and Evening Regular Classes

(For Boys & Girls)

اہلیت: **F.A, ICS, F.SC** یا کسی بھی وفاق سے ثانویہ خاصہ کیا ہو۔

- اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی طرف سے ہمارے پاس سمیسٹر 1 اور سمیسٹر 5 میں 100+100 یعنی کل 200 نشستیں موجود ہیں۔
- عالیہ/بی اے کی سند کے حاملین کے لیے ڈائریکٹ 5th سمیسٹر میں داخلہ۔

داخلہ جاری ہے برائے سیشن (فال 2026)

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتے ہوئے قرآن و سنت کے حقیقی علم سے بھی بہرہ ور ہوں، تو آیئے جامعۃ لاہور الاسلامیۃ نے اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے ایک نئے شاندار تعلیمی نظام کو متعارف کروایا ہے، جہاں درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ BS اسلامک سٹڈیز ریگولر کلاسز کی معیاری تعلیم دی جا رہی ہے۔

اب آپ کے بچے دین و دنیا کی کامیابی کے لیے مضبوط علمی بنیاد حاصل کر سکتے ہیں۔

خصوصیات

- تعلیم کے ساتھ بہترین تربیت تاکہ علم کے ساتھ کردار بھی سنورے
- درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ جدید عصری تعلیم کا حسین امتزاج
- بی ایس کی ڈگری، جو تعلیمی و پیشہ ورانہ ترقی میں معاون ثابت ہو
- عربی زبان میں مہارت کے لیے خصوصی توجہ
- قرآن و حدیث کا گہرا فہم اور فقہی بصیرت
- آرام دہ اور پرسکون تعلیمی ماحول
- پانچ کنال پر مشتمل شاندار بلڈنگ
- غیر نصابی سرگرمیاں

شرائط داخلہ

- ریگولر بی ایس (اسلامیات) میں داخلہ کے لئے ایف اے پاس ہونا ضروری
جبکہ ثانویہ عامہ یا میٹرک پاس طلباء کے لیے 6 سالہ درس نظامی + ریگولر بی ایس
- داخلہ تحریری و تقریری ٹیسٹ کی بنیاد پر ہوگا
- داخلے کے وقت والد/سرپرست کی موجودگی لازمی ہے
- رجسٹریشن فیس: 500 روپے (آن لائن فارم کے ساتھ جمع کروانا لازمی)
- رجسٹریشن کے لیے درج ذیل معلومات دیے گئے نمبر پر واٹس ایپ کریں:
نام/ولدیت/سابقہ تعلیمی قابلیت/مکمل پتہ/رابطہ نمبر

بمقام

ہیڈ آفس: 91- بابر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

الداعی

ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی
قائمقام رئیس جامعہ لاہور الاسلامیہ

برائے رابطہ

0304-4328010
0322-4339822
0300-4011204

ملّتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی

مدیر: ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی

مُحدّث
لاہور پاکستان

جلد 57 — ستمبر 2026ء / ربیع الاول ۱۴۴۸ھ — عدد 05

مجلس مشاورت
- مولانا ارشاد الحق اثری ▪ حافظ عبد الستار حماد ▪ مولانا محمد شفیق مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ حسن مدنی
- ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ▪ ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام ▪ ڈاکٹر جواد حیدر ▪ ڈاکٹر آصف جاوید

فہرست مضامین

اداریہ	مشترکہ دفاعی معاہدہ... میثاق مکہ	حافظ ابتسام الٰہی ظہیر	4
عقائد اہل سنت	شرح کتاب التوحید قسط ۱۴	ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی	12
سیرت الرسول ﷺ	رسول اللہ ﷺ سے پہلی ملاقات	عبد الرحمن عزیز	17
عقیدہ و منہج	عقائدی اختلافات کی الجھن اور اعتدال کا راستہ	شیخ عبد الحی یوسف	36
فکر و منہاج	اشاعرہ محدثین میزانِ عدل میں	شیخ علوی بن عبد القادر السقاف	40
تحقیق و تنقید	مولانا اصلاحی کی مفسرین اور فقہا پر الزام تراشیاں	پروفیسر محمد رفیق	76
تبصرہ کتب	امین احسن اصلاحی: ایک متنازعہ مفسر	عبد الرحمن عزیز	83
سوانح حیات	مولانا فاروق راشدی کی وفات	ڈاکٹر فہد اللہ مراد	85
وفیات	ڈاکٹر مازن مبارک، مولانا ابو بکر صدیق سلفی، امیر العظیم وغیرہ	ڈاکٹر حافظ ابو عمرو	89

مدیر معاون
عبد الرحمن عزیز
0308-4131740

مینیجر
محمد اصغر
0305-4600861

زرسالانہ =/1200 روپے
فی شمارہ =/200 روپے

بیرون ملک
زرسالانہ =/30 ڈالر
فی شمارہ =/5 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں!

مشترکہ دفاعی معاہدہ

دنیا میں وہ قومیں ہمیشہ اہمیت کی حامل رہی ہیں جنہوں نے اپنے عسکری اور دفاعی معاملات کو اہمیت دی۔ جن اقوام نے اس حوالے سے تساہل کا مظاہرہ کیا، وہ اقوام کمزور رہیں اور کئی مرتبہ انہیں بیرونی جارحیت کا نشانہ بننا پڑا۔ تاریخِ عالم اس حقیقت کی گواہ ہے کہ امن کی خواہش اپنی جگہ ایک قابلِ قدر جذبہ ہے، لیکن امن کے قیام کے لیے قوت، تیاری، نظم، اتحاد اور بروقت فیصلہ بھی نہایت اہم ہے۔ جو قوم اپنی آزادی، سرحدوں، قومی مفادات اور تہذیبی تشخص کے تحفظ کی صلاحیت پر توجہ نہیں دیتی وہ بالآخر دوسروں کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔

کتاب وسنت نے دفاعی صلاحیت، تیاری اور قوت کے حصول کو بہت اہمیت دی ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾

[الأنفال: ٦٠]

"جہاں تک تم سے ہو سکے ان کے مقابلے کے لیے قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن پر رعب قائم کر سکو۔"

یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام کی نظر میں قوت کے حصول اور اظہار کا مقصد ظلم، جارحیت یا دوسروں کے حقوق غصب کرنا نہیں بلکہ ظلم و جارحیت کو روکنا، کمزوروں کی حفاظت کرنا اور امن کو یقینی بنانا ہے۔ چنانچہ ایک مضبوط دفاعی قوت دراصل پائیدار امن کی ضمانت دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی سرحدوں کی حفاظت کو غیر معمولی اہمیت دی تھی۔ اس حوالے سے بعض اہم احادیث درج ذیل ہیں:

① حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کے راستے میں دشمن سے ملی ہوئی سرحد پر ایک دن کا پہرہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے، جنت میں

کسی کے لیے ایک کوڑے جتنی جگہ دنیا ومافیہا سے بڑھ کر ہے اور جو شخص اللہ کے راستے میں شام کو نکلے یا صبح کو تو وہ دنیا ومافیہا سے بہتر ہے[1]۔"

۲ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"ایک دن اور ایک رات سرحد پر پہرہ دینا ایک ماہ کے روزوں اور قیام سے بہتر ہے اور اگر پہرہ دینے والا فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جو وہ کر رہا تھا آئندہ بھی جاری رہے گا، اس کے لیے اس کا رزق جاری کیا جائے گا اور وہ امتحان لینے والے سے محفوظ رہے گا[2]۔"

۳ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ہر شخص کا عمل اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے، مورچہ زن کے سوا، اس کے عمل میں قیامت تک اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ قبر کے عذاب یا منکر ونکیر کے سوال وجواب سے بھی امن میں رہتا ہے۔"

۴ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

"دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے تر ہوئی ہو اور ایک وہ آنکھ جس نے راہِ جہاد میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو[3]۔"

نبی کریم ﷺ خود بھی اسلامی سرحدوں کے دفاع میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت ایک آواز سنائی دی تو اہلِ مدینہ گھبرا گئے۔ رسول کریم ﷺ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر، جس کی پیٹھ ننگی تھی، حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے تنہا اطرافِ مدینہ میں سب سے آگے تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو تلوار آپ ﷺ کی گردن میں حمائل تھی اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں[4]۔"

مذکورہ بالا احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی سرحدوں کا دفاع، دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے تیاری اور مسلمانوں کی جان ومال، عزت اور آزادی کی حفاظت اسلام میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔

---

۱ صحیح بخاری: ۲۸۹۲

۲ صحیح مسلم: ۱۹۱۳

۳ سنن ترمذی: ۱۶۳۹

۴ صحیح بخاری: ۲۹۰۸، صحیح مسلم: ۲۳۰۷

گزشتہ کئی عشروں سے، بہت سے مسلمان ممالک اپنے دفاع کے حوالے سے کمزوری کا شکار رہے ہیں، جبکہ بہت سے غیر مسلم اور مغربی ممالک نے دفاعی ٹیکنالوجی، عسکری تحقیق، انٹیلی جنس، فضائی قوت، بحری طاقت، سائبر جنگ، خلائی ٹیکنالوجی اور جدید اسلحہ سازی کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس دفاعی برتری کے اثرات عالمی سیاست پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔

فلسطین کا مسئلہ اس حقیقت کی ایک المناک مثال ہے۔ اسرائیل کی عسکری طاقت نے خطے میں طاقت کا ایسا عدم توازن قائم کیا ہے جس کے باعث فلسطینی عوام مسلسل ایک پیچیدہ اور طویل بحران کا سامنا کر رہے ہیں۔ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی جنوبی ایشیا میں کئی دہائیوں سے ایک اہم تنازع کی صورت میں موجود ہے۔ اس طوالت کی وجہ بھارت کی عسکری قوت اور اس کی بنیاد پر کی جانے والی جارحیت ہے۔ یہ صورتِ حال دنیا بھر کے مسلمانوں میں اس احساس کو تقویت دیتی رہی ہے کہ امتِ مسلمہ کو جذبات کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم، معیشت، سائنس، ٹیکنالوجی، دفاع، سفارت کاری اور باہمی تعاون کے میدانوں میں حقیقی قوت پیدا کرنا ہوگی۔

موجودہ دور میں دفاع صرف توپ، ٹینک اور جنگی طیارے کا نام نہیں رہا۔ آج دفاع میں سیٹلائٹ، مصنوعی ذہانت، سائبر سکیورٹی، ڈرون ٹیکنالوجی، الیکٹرانک وارفیئر، میزائل ڈیفنس، انٹیلی جنس، خلائی نگرانی، جدید مواصلاتی نظام، سائبر انٹیلی جنس اور دفاعی صنعت سب شامل ہیں۔ جس ملک کے پاس جدید تحقیق اور سائنسی بنیاد نہ ہو، وہ روایتی اسلحہ رکھنے کے باوجود اپنے دفاع کے لیے دوسروں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

موجودہ دنیا میں دفاعی اعتبار سے اتحاد اور معاہدوں کی بھی غیر معمولی اہمیت ہے۔ مغربی ممالک نے نیٹو کی صورت میں ایک ایسا اجتماعی دفاعی نظم قائم کیا جس نے کئی دہائیوں تک یورپ اور شمالی اوقیانوس کے خطے میں طاقت کا ایک تاثر قائم کیے رکھا۔ اس معاہدے سے نہ صرف یورپ محفوظ ہوا ہے، بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کے اثرات محسوس کیے جاتے ہیں۔

اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی ایک رکن کو درپیش سنگین فوجی خطرہ محض اس ملک کا ذاتی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ اتحادیوں کے لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

اس کے مقابلے میں مسلم دنیا کے پاس طویل عرصے تک کوئی ایسا جامع اور مؤثر اجتماعی دفاعی نظم موجود نہیں تھا جس میں مختلف طاقتور مسلم ممالک ایک مشترکہ دفاعی تصور کے تحت باقاعدہ طور پر اکٹھے ہوں۔ اسی پس منظر میں "مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے" کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

عالمِ اسلام کے مسلمان اس وقت خوشی اور مسرت سے لبریز ہو گئے جب ان کی تشنہ آرزوئیں اور

برس ہا برس کی نیک تمنائیں ایک نئی شکل میں حقیقت کا رنگ اختیار کرتی دکھائی دیں۔

۷ اگست ۲۰۲۶ء کو پاکستان، ترکیہ اور سعودی عرب نے مکہ مکرمہ میں مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ (Makkah/Mecca Joint Defence Agreement) پر دستخط کیے۔ یہ معاہدہ مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والی اعلیٰ سطحی ملاقات کے دوران طے پایا، جس میں سعودی ولی عہد محمد بن سلمان، ترک صدر رجب طیب اردوان اور پاکستان کے وزیر اعظم شہباز شریف شریک ہوئے۔

معاہدے کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ تینوں ممالک نے اجتماعی دفاع کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ ان میں سے کسی ایک ریاست پر مسلح حملہ تینوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دفاعی تعاون کے مختلف پہلوؤں کو مزید مضبوط بنانے کا عزم بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ اعلان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جب مشرقِ وسطیٰ میں کشیدگی غیر معمولی سطح پر پہنچ چکی ہے اور سعودی عرب سمیت خطے کے کئی ممالک اپنی سلامتی کے بارے میں نئے سوالات کا سامنا کر رہے ہیں

سعودی عرب، ترکی یا پاکستان نے واضح کیا ہے کہ یہ معاہدہ کسی مخصوص ملک کے خلاف جارحانہ اتحاد نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت دفاعی، اجتماعی سلامتی اور علاقائی استحکام کی ہے۔

اس تاریخی معاہدے کے تینوں فریق دنیائے اسلام میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ ایک منفرد قوت رکھتا ہے۔

پاکستان، اللہ کے فضل و کرم سے دنیا کی واحد جوہری ہتھیار رکھنے والی مسلم اکثریتی ریاست ہے۔ اس کے پاس ایک بڑی فوج، جوہری ڈیٹرنس، میزائل ٹیکنالوجی، فضائی صلاحیت، دفاعی پیداوار کا تجربہ اور خطے میں ایک اہم جغرافیائی محل وقوع موجود ہے۔ اس کی مسلح افواج کو کئی دہائیوں کا دفاعی تجربہ حاصل ہے اور ملک نے مختلف النوع سلامتی کے چیلنجز کا سامنا کیا ہے۔ مئی ۲۰۲۵ء میں پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی دفاعی صلاحیت کھل کر سامنے آئی جس کا پوری دنیا کے ماہرین نے اعتراف کیا۔ اس کی فوجی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس کا جغرافیہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، چین، افغانستان، اور خلیجی خطے کے درمیان ایک اہم پل کی حیثیت رکھتا ہے... یہی وجہ ہے کہ مکہ دفاعی معاہدے میں پاکستان کی شمولیت اس معاہدے کو ایک منفرد اسٹریٹیجک وزن عطا کرتی ہے۔

سعودی عرب عالم اسلام کا ایک نمایاں ترین ملک ہے۔ اس کے پاس بے پناہ معاشی وسائل، اہم جغرافیائی محل وقوع، توانائی کے وسیع ذخائر اور خطے میں نمایاں سیاسی اثر و رسوخ موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر حرمین

شریفین کی تولیت کی وجہ سے پوری امتِ مسلمہ کے دل اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ شاہ فیصل مرحوم اور شاہ فہد مرحوم جیسے سعودی حکمرانوں کی اسلام اور ملتِ اسلامیہ سے وابستگی بھی مسلم دنیا کی اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے۔ حرمین شریفین کی خدمت اور قرآن مجید کی اشاعت وترویج کے میدان میں سعودی عرب نے بھی طویل عرصے سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سعودی عرب کی دفاعی سلامتی صرف سعودی عرب کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے خلیجی خطے، عالمی توانائی کی منڈیوں اور بین الاقوامی تجارت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔

پاکستان کے اپنے قیام سے لے کر آج تک سعودی عرب کے ساتھ برادرانہ تعلقات رہے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان دفاع، معیشت، دینی اخوت، عوامی روابط اور باہمی تعاون کی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔

ترکی بھی عالمِ اسلام کی ایک اہم طاقت ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے اس کی حیثیت انتہائی منفرد ہے کیونکہ یہ یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔

ترکیہ کی ایک بڑی طاقت اس کی تیزی سے ترقی کرتی ہوئی دفاعی صنعت ہے۔ ڈرونز، بغیر پائلٹ دفاعی نظام، بحری ٹیکنالوجی، بکتر بند گاڑیاں، میزائل اور مختلف جدید دفاعی نظاموں میں ترکی نے گزشتہ برسوں میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔

مکہ دفاعی معاہدے میں پاکستان کی عسکری صلاحیت، سعودی عرب کی معاشی وجغرافیائی قوت اور ترکیہ کی دفاعی ٹیکنالوجی باہم مل کر ایک نئی نوعیت کی اسٹریٹجک شراکت داری تشکیل دے سکتی ہیں۔

اس معاہدے کو صرف جنگی اتحاد سمجھنا شاید اس کی مکمل تصویر نہیں ہوگی۔ اصل اہمیت اس بات میں ہے کہ تین ممالک نے اپنی اجتماعی سلامتی کو ایک مشترکہ دینی اور نظریاتی وحدت کے ساتھ جوڑنے کا آغاز کیا ہے۔

دفاعی تعاون اگر درست سمت میں آگے بڑھتا ہے تو اس کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ ترکی نے بعد میں معاہدے کے حوالے سے دفاعی تعاون، مشترکہ فوجی مشقوں، دفاعی صنعت، ٹیکنالوجی اور جدید عسکری شعبوں میں تعاون کے امکانات پر بھی بات کی ہے۔ تاہم معاہدے کا مکمل قانونی متن عوامی سطح پر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تمام عملی شقوں کو حتمی شکل میں بیان کرنا قبل از وقت ہوگا۔

اس معاہدے کے بعد پاکستان کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ پاکستان کو اب صرف یہ نہیں دیکھنا کہ اس معاہدے سے وہ سیاسی یا سفارتی فائدہ کتنا حاصل کر سکتا ہے، بلکہ اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ایک ذمہ دار، قابلِ اعتماد اور امن پسند دفاعی شراکت دار ہے۔

اگر پاکستان اپنی دفاعی صلاحیت کو سفارتی بصیرت، اقتصادی استحکام، جدید ٹیکنالوجی اور دانش مندانہ خارجہ پالیسی کے ساتھ جوڑ دے تو اس کا عالمی کردار آنے والے برسوں میں مزید بڑھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان امن، خود مختاری، قومی مفاد اور اجتماعی سلامتی کے اصولوں کو سامنے رکھے۔

مکہ دفاعی معاہدے کے سامنے آنے کے بعد بعض حلقوں میں اسے "اسلامی نیٹو" کا نام دیا جارہا ہے، لیکن فی الحال اس تعبیر کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ کیونکہ نیٹو ایک انتہائی منظم، طویل عرصے سے قائم اور وسیع ادارہ جاتی ڈھانچہ رکھنے والا اتحاد ہے۔ مکہ معاہدہ اس مرحلے پر صرف تین ممالک کے درمیان ایک اہم دفاعی معاہدہ ہے اور اس کے مکمل عملی ڈھانچے، کمانڈ سسٹم، تعیناتی کے طریقۂ کار اور دیگر تفصیلات کے بارے میں ابھی مزید معلومات درکار ہیں۔ البتہ اس معاہدے کو ایک مثبت ابتدائی قدم ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگر مستقبل میں مزید مسلم ممالک اس نوعیت کے دفاعی تعاون میں شریک ہوتے ہیں، مشترکہ دفاعی منصوبہ بندی وجود میں آتی ہے، باقاعدہ مشقیں ہوتی ہیں، انٹیلی جنس شیئرنگ کا نظام قائم ہوتا ہے، دفاعی صنعتیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑتی ہیں اور مشترکہ کمانڈ و رابطہ کاری کے مؤثر ادارے تشکیل پاتے ہیں تو یہ معاہدہ مسلم دنیا کے اجتماعی دفاع کے ایک بڑے تصور کی بنیاد بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ترکی کی جانب سے مصر کے ساتھ بھی رابطوں کا ذکر سامنے آیا ہے۔

اگر مصر، خلیجی ممالک، وسطی ایشیا یا دوسرے مسلم ممالک مختلف سطحوں پر دفاعی تعاون کے نظام میں شامل ہوتے ہیں تو مسلم دنیا کے پاس ایک ایسا نیٹ ورک تشکیل پانے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے جو صرف عسکری اعتبار سے نہیں بلکہ سیاسی، اقتصادی اور تکنیکی اعتبار سے بھی اہم ہو۔

اس معاہدے نے عالمی سطح پر نئی اسٹریٹیجک بحث کو جنم دیا ہے۔ بعض تجزیوں میں اسے پاکستان کے لیے ایک اضافی سفارتی اور دفاعی وزن کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے بھارت اسرائیل نے باقاعدہ اعلیٰ سطحی رابطے بھی قائم کیے ہیں۔

اس موقع پر اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ امتِ مسلمہ کو اس وقت مزید جنگوں سے بڑھ کر ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو جنگ کو روک سکے۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے بچنے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا ہے۔[1]

---

1 سورۃ آل عمران: ۱۰۳

اسلام کا اجتماعی تصور صرف جذباتی وابستگی کا نام نہیں بلکہ نظم، تعاون، مشاورت، ذمہ داری اور باہمی نصرت کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

مکہ معاہدے کی اصل روح بھی اسی وقت مضبوط ہو سکتی ہے جب تینوں ممالک ایک دوسرے کی طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دوسرے کی کمزوریوں کو دور کریں۔

پاکستان کے پاس افرادی اور عسکری تجربہ ہے۔ ترکیہ کے پاس دفاعی صنعت، ٹیکنالوجی اور جدید عسکری تحقیق کا وسیع تجربہ ہے۔ اور سعودی عرب کے پاس غیر معمولی مالی وسائل، توانائی کی قوت، جغرافیائی اہمیت اور عالم اسلام میں منفرد مذہبی وسیاسی مقام ہے۔

اگر مکہ دفاعی تعاون کو ایک حقیقی اور پائیدار قوت بنانا ہے تو اسے مسلم دنیا کے وسیع تر اقتصادی، علمی اور صنعتی تعاون کے ساتھ جوڑنا ہو گا۔

اگر یہ تینوں قوتیں ایک دوسرے کی تکمیل بن جائیں تو اس تعاون کے اثرات محض فوجی میدان تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ ان شاء اللہ

اس معاہدے کی سب سے بڑی علامتی اہمیت شاید یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے کہ مسلم ممالک اپنی سلامتی کے معاملات میں زیادہ خود انحصار ہو سکتے ہیں۔

طویل عرصے سے مسلم دنیا کے بہت سے ممالک اپنی دفاعی ضروریات کے لیے بڑی طاقتوں پر انحصار کرتے رہے ہیں۔ اس انحصار نے کئی مرتبہ ان کی خارجہ پالیسی کو محدود کیا۔ اگر مسلم ممالک اپنی مشترکہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں تو وہ عالمی طاقتوں سے دشمنی کیے بغیر اپنے لیے زیادہ متوازن اور باوقار خارجہ پالیسی اختیار کر سکتے ہیں۔

اس معاہدے میں "مکہ" کا نام بھی ایک علامتی معنی رکھتا ہے۔ اگر اس سرزمین پر ہونے والا یہ دفاعی معاہدہ مسلم دنیا کو باہمی احترام، اتحاد، تعاون اور اجتماعی ذمہ داری کی طرف لے جاتا ہے تو اس کی معنوی اہمیت ایک سیاسی معاہدے سے کہیں بڑھ کر زندگی کے تمام شعبوں میں تعاون کی اساس بن سکتا ہے۔

کسی بھی معاہدے پر دستخط کرنا آسان مرحلہ ہوتا ہے، اصل امتحان اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اس پورے معاملے میں پاکستان کی ذمہ داری خاص طور پر اہم ہے۔ اسے اپنی جوہری صلاحیت کو محض طاقت کے اظہار کے بجائے ذمہ دارانہ دفاعی ڈیٹرنس کے طور پر برقرار رکھنا ہو گا۔ اپنی روایتی فوجی صلاحیت کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت اور سفارت کاری کو بھی مضبوط بنانا ہو گا۔

ماضی میں مختلف مسلم ممالک کے درمیان سفارتی رابطوں میں پاکستان کا کردار نہایت شاندار رہا ہے۔ اب اگر پاکستان اپنے تجربے کی بنیاد پر سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان ایک مؤثر پل کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ بھی تعمیری تعلقات کو آگے بڑھاتا ہے تو اس کا عالمی کردار یقیناً بڑھ سکتا ہے۔

یہ معاہدہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ اس کے عملی اثرات آنے والے برسوں میں مزید واضح ہوں گے۔ اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ تینوں ممالک اسے کس حد تک ادارہ جاتی شکل دیتے ہیں اور دفاعی تعاون کو محض اعلانات سے نکال کر عملی منصوبوں میں تبدیل کرتے ہیں۔

بہرحال اس معاہدے نے ایک اہم پیغام ضرور دیا ہے:

مسلم دنیا اگر اپنی قوتوں کو منتشر رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے تجربات، وسائل، ٹیکنالوجی اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے تو وہ عالمی نظام میں زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔

آج امتِ مسلمہ کو صرف جذباتی اتحاد نہیں بلکہ علم کا اتحاد، معیشت کا اتحاد، ٹیکنالوجی کا اتحاد، سفارت کاری کا اتحاد اور دفاعی تعاون درکار ہے۔

اگر مکہ معاہدہ اس بڑے سفر کا پہلا قدم ہے۔ اگر اس کے بعد مزید مسلم ممالک بھی باہمی اعتماد، خودمختاری، امن، دفاع اور تعاون کے اصولوں پر آگے بڑھتے ہیں تو ممکن ہے کہ آج کا یہ چھوٹا سا دائرہ کل ایک وسیع تر مسلم دفاعی اور اسٹریٹجک تعاون کی بنیاد بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو جغرافیائی اہمیت، افرادی قوت، عسکری صلاحیت اور جوہری دفاع جیسی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا بہترین استعمال یہی ہے کہ پاکستان امتِ مسلمہ کے اندر اختلافات کم کرنے، دفاعی خود انحصاری بڑھانے، مظلوموں کے لیے مؤثر سفارتی آواز بننے اور خطے میں امن و استحکام کے قیام کے لیے مثبت کردار ادا کرے۔

دعا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہونے والا یہ معاہدہ محض کاغذ پر لکھی ہوئی چند سطروں تک محدود نہ رہے بلکہ حقیقی امن، باہمی اعتماد، دفاعی خود انحصاری اور امتِ مسلمہ کے بہتر مستقبل کا ذریعہ بنے۔

اللہ تعالیٰ بلادِ اسلامیہ کی حفاظت فرمائے، مسلم ممالک کو باہمی اتحاد و اتفاق نصیب فرمائے، مسلمانوں کو علم، سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت اور دفاع کے میدانوں میں ترقی عطا فرمائے، مظلوم مسلمانوں کی مدد فرمائے، پاکستان، سعودی عرب، ترکیہ اور تمام مسلم ممالک کو استحکام اور ترقی کی شاہراہ پر چلائے آمین

(حافظ ابتسام الٰہی ظہیر)

قسط (۱۴)

شرح کتاب التوحید (صحیح بخاری)

افادات: ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی
ترتیب: حافظ عبد الرحمن عزیز

بَابُ مُقَلِّبِ القُلُوبِ

باب: اللہ تعالیٰ دلوں کا پھیرنے والا ہے

وَقَوْلُ اللہِ تَعَالَىٰ: ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ﴾ [الأنعام: ۱۱۰]

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے۔''

قلب کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا اور پھیرنا ہے۔

علامہ عبد الحق ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس عنوان میں امام بخاریؒ نے اللہ تعالیٰ کے اسمِ مبارک ''مُقَلِّبُ القلوب'' کی طرف اشارہ کیا ہے، ساتھ ہی ''تقلیب'' کی صفت کے اثبات کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ تقلیب کا اصل معنی کسی چیز کو ایک حال سے دوسرے حال میں بدل دینا ہے۔ چنانچہ دلوں اور فہم و ادراک کو ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف منتقل کرنا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کا مرجع قدرت ہے۔ ممکن ہے امام بخاریؒ کا مقصد اس عنوان کے ذریعے ان لوگوں کا رد کرنا ہو جو یہ کہتے ہیں کہ دلوں کے افعال، جیسے ارادہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں بلکہ بندے کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو کہ انہوں نے باب میں مذکورہ آیت میں ''تقلب'' کی تفسیر ''طبع'' (مہر لگانا) کی ہے۔ اور ان کے ہاں ''طبع'' کا معنی ترک کرنا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے ہاں آیت کا معنی ہو گا ''ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور ان کے نفسوں کے لیے کچھ بھی پسند نہیں کیا''۔ حالانکہ عربی زبان میں التقلیب کا یہ معنی نہیں ہے۔ لہٰذا ''طبع'' (مہر لگانے) کا معنی ترک کرنا درست نہیں ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک طبع کا معنی ہے کافر کے دل میں کفر کو تخلیق کرنا اور اس کو اس پر جما دینا یہاں تک کہ وہ مر جائے[1]۔''

---

1 شرح کتاب التوحید از علامہ عبد الحق الہاشمی: ۵۲

"تقلیبُ القلوب" اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے اس میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں:

نسبة تقلب القلوب الى الله اشعار بأنه يتولى قلوب عباده و لا يكلها الى أحد من خلقه.[1]

"دلوں کو پھیرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرنا، یہ دراصل علامت ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے دلوں کا مالک ہے، مخلوق میں سے کسی کے سپرد نہیں کیا۔"

اللہ تعالیٰ کی صفت؛ بندوں کے دلوں کو پھیرنے کے دو پہلو ہیں:

① کائنات میں کلی تصرف کا اختیار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، حتیٰ کہ انسانوں جیسی عقل و دانش اور اختیار رکھنے والی مخلوق کے دل بھی حقیقت میں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سابقہ باب کا تکملہ ہے۔ یعنی دلوں کا اس کی مرضی سے پھرنا اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے میں داخل ہے۔

② دوسرا پہلو بندوں کے اعتبار سے ہے کہ اگر بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بندوں کے اختیار کی کیا حیثیت ہے؟۔

اس اعتبار سے اس باب کا تعلق تقدیر کے ساتھ ہے اور اس سے بندوں کے اختیار کی بحث پیدا ہوتی ہے۔

اس دوسرے پہلو کے اعتبار سے کلامی فرقوں میں شدید اختلاف ہے۔ مثلاً

فرقہ 'قدریہ' کا موقف ہے کہ بندہ اپنے ارادے اور قدرت میں خود مختار اور مستقل حیثیت رکھتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ جبکہ 'جبریہ' کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال و اعمال میں مجبور محض ہے اسے کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ جو کچھ کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے۔

پہلے موقف کی زد اللہ تعالیٰ کے اختیار پر پڑتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق کے بعد بالکل فارغ ہے، اسے کائنات میں تصرفات یا تدبیر کا کچھ حق حاصل نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ﴾ [السجدة: ٥]

"وہی آسمان سے زمین تک کے انتظام کی تدبیر کرتا ہے۔"

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ

---

1 فتح الباری: ۱۴/ ۳۲۲

﴿الْأَمْرَ﴾ [یونس: ۳]

"تمہارا پروردگار یقیناً وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر قرار پکڑا، وہی کائنات کا انتظام چلاتا ہے۔"

﴿وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ﴾ [یونس: ۳۱]

"اور کون ہے جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے؟ وہ فوراً بول اٹھیں گے کہ 'اللہ'۔"

اس موقف کو درست مان لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ انسان بلکہ ہر ہر فرد خالق ومالک ہے۔ اور یہ موقف توحید باری تعالیٰ کے صریح خلاف ہے۔

اور 'جبریہ' کا موقف اللہ تعالیٰ کی تدبیر فی الخلق کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [التکویر: ۲۹]

"اور تم چاہ نہیں سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ رب العالمین چاہتا ہو۔"

مزید فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ۹۶]

"حالانکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان (اعمال) کو بھی جو تم کرتے ہو۔"

اہل سنت کا موقف ہی اعتدال پر مبنی ہے، کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس نے انسان کو ارادہ و عمل انجام دینے کا اختیار دیا ہے۔ انسان بغیر کسی جبر و اکراہ کے اپنی مرضی سے اعمال انجام دیتا ہے۔ اس لیے قیامت کے دن اسی اختیار کی بنا پر اس سے باز پرس ہوگی۔ یعنی افعال کے خلق کی نسبت اللہ کی طرف اور اسے انجام دینے کی نسبت انسان کی طرف ہوگی۔ اس اعتبار سے انسانی اعمال کی نسبت کبھی اللہ کی طرف ہوتی ہے اور کبھی انسان کی طرف۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ﴾ [الأنعام: ۱۱۰] کا معنی ہے لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق پھیرنا[1]۔

دلوں کو پھیرنے کے ساتھ آنکھ کو پھیرنے کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ہدایت میں دل کے بعد سب سے

---

1 فتح الباری: ۱۴/ ۳۲۲

اہم کردار آنکھ کا ہوتا ہے۔ جس چیز کو دل پسند کرتا ہے، آنکھ اسی طرف پھرتی ہے اور آدمی اسی لائن پر چل پڑتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ڈرائیور جس طرف متوجہ ہوتا ہے خود بخود اس کے ہاتھ اسی طرف سٹیرنگ کو گھماتے ہیں اور اسی سمت گاڑی مڑتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کی گاڑی دل اور آنکھ کے تابع ہو کر چلتی ہے۔

٧٣٩١ - حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ سَالِمٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: أَكْثَرُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْلِفُ: «لاَ وَمُقَلِّبِ الْقُلُوبِ».

"سعید بن سلیمان نے ہمیں بیان کیا، عبد اللہ ابن المبارک سے، انہوں نے موسیٰ بن عقبہ سے سالم کے حوالے سے اور انہوں نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ اس طرح قسم اٹھاتے تھے: "نہیں، دلوں کو پھیرنے والے کی قسم۔"

لطائف الاسناد

اس حدیث کی سند میں تمام راوی ائمہ حفاظ ہیں، مثلاً سعید بن سلیمان ائمہ حفاظ میں سے ہیں۔ ابن مبارک سے مراد مشہور امام عبد اللہ بن مبارک ہیں، موسیٰ بن عقبہ معروف محدث اور امام مغازی ہیں۔ فن سیرت میں ان کا بہت بڑا کارنامہ "کتاب المغازی" کی تالیف ہے، بلکہ آپ ہی نے فن سیرت کا علمی پیمانہ مقرر کیا جس پر متاخرین نے سیرت نگاری کی عمارت قائم کی۔[1]

شرح الحدیث

قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی اٹھائی جا سکتی ہے، مخلوق کی قسم اٹھانا جائز نہیں ہے، تو جب رسول اللہ ﷺ 'مقلب القلوب' کی قسم اٹھاتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مزید اس کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ، كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ» ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اللهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ».[2]

---

1 کتاب المغازی للواقدی، مقدمہ تحقیق: مارسڈن جونس، موئسسۃ الاعلمی، بیروت، لبنان

2 صحیح مسلم: ۲۶۵۴

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: تمام بنو آدم کے دل ایک دل کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے اسے گھماتا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (دعا کرتے ہوئے) فرمایا: اے اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے۔"

اس حدیث سے مذکورہ بالا آیت اور حدیث کا مقصد بھی واضح ہو گیا۔ دوسرا یہ معلوم ہو گیا کہ بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، وہ اپنے اصولوں کے مطابق جس کا دل جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ تیسرا یہ پتا چلا کہ مذکورہ آیات واحادیث کا مقصد کلامی بحوث نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ بندے کو اپنے دل کی اصلاح کے لیے اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا﴾ [آل عمران: ۸]

"اے ہمارے رب! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کج رو نہ بنا دینا۔"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"امام بخاری کی ذکر کردہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب کے تمام اعمال مثلاً ارادہ کرنا وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں[1]۔"

فوائد

① دلوں کو پھیرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

② اللہ تعالیٰ جس طرح انسان کا خالق ہے، اسی طرح انسانی افعال بھی اسی کے تخلیق کردہ ہیں۔

③ لیکن انسان اعمال کا ارادہ کرنے اور انہیں بجالانے میں خود مختار ہے۔

④ انسانی اعمال کی نسبت اللہ کی طرف اس کی خلق کے اعتبار سے اور انسان کی طرف ارادہ وانجام دینے کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے۔

جب انسانوں کے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں، تو انسان ہر لحہ اللہ کی توفیق کا محتاج ہے۔ لہٰذا انسان کو ہدایت اور عمل صالح کی توفیق کے لیے اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

---

1 فتح الباری: ۱۱/ ۶۴۲

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پہلی ملاقات

عبدالرحمن عزیز

ملاقات کسی بھی انسان کی شخصیت کا پہلا تعارف ہوتی ہے۔ بسا اوقات چند لمحوں کی ایک مختصر ملاقات ایسی دیرپا یاد چھوڑ جاتی ہے جو برسوں بلکہ پوری زندگی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ خصوصاً پہلی ملاقات کی اہمیت اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس کے تاثرات عموماً فطری، بے ساختہ اور حقیقت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ بعد کی ملاقاتیں اکثر پہلی ملاقات سے قائم ہونے والے ذہنی تاثر کے زیرِ اثر ہوتی ہیں، لیکن پہلی ملاقات میں انسان عموماً ہر قسم کے مثبت یا منفی تعصب، سابقہ تجربے اور ذاتی تعلق سے خالی الذہن ہوتا ہے۔ اسی لیے سامنے والے کی شخصیت کا جو نقش اس کے دل و دماغ پر پہلی مرتبہ ثبت ہوتا ہے، وہ نہایت گہرا، دیرپا اور فیصلہ کن ہوتا ہے(First imprasion as the last imprasion)۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو برسوں بعد بھی اپنی پہلی ملاقات کا مقام، ماحول، گفتگو، بلکہ بعض اوقات سامنے والے کے لباس کا رنگ تک یاد رہتا ہے۔

ماہرینِ نفسیات اور دانش وروں کا اتفاق ہے کہ پہلی ملاقات میں انسان کا اندازِ گفتگو، اخلاق، طرزِ عمل، چہرے کے تاثرات اور مجموعی شخصیت دوسروں کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ سفارتی، سیاسی اور سماجی دنیا میں پہلی ملاقات کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کے لیے باقاعدہ آداب، پروٹوکول اور تیاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ایک روز میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلی مرتبہ ملاقات کرنے والوں کے دلوں پر آپ ﷺ کی شخصیت نے کیا اثر ڈالا؟ انہوں نے آپ ﷺ کو پہلی نظر میں کس انداز سے دیکھا؟ ان کی زبان سے آپ ﷺ کے بارے میں کون سے تاثرات ادا ہوئے؟ اور ان چند لمحوں کی ملاقات نے ان کی زندگی کا رخ کس طرح بدل دیا؟

اسی سوال نے مجھے کتبِ حدیث، سیرت، شمائل اور تاریخ کے مطالعے پر آمادہ کیا۔ اس تحقیق کے دوران مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ مختلف صحابہ، اہلِ کتاب، غیر مسلموں، وفود اور دیگر ملاقات کرنے والوں کے ایسے بے شمار تاثرات منتشر صورت میں محفوظ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی عظمتِ کردار، حسنِ اخلاق،

جاذبیتِ شخصیت اور صداقتِ نبوت کی نہایت روشن تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر تاثر اپنی جگہ منفرد، دل نشین اور فکر انگیز ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی پہلی ملاقات محض ایک رسمی تعارف نہ تھی، بلکہ ایک ایسا روحانی، فکری اور قلبی انقلاب تھی جس نے ان کی سوچ، کردار، اخلاق اور زندگی کے ہر پہلو کو بدل کر رکھ دیا۔ کسی نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر نظر پڑتے ہی نبوت کی سچائی کو پہچان لیا، کسی نے آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآنِ کریم کی تلاوت سن کر اپنے دل کی دنیا بدلتی محسوس کی، کسی نے آپ ﷺ کے حلم، تواضع اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور کسی نے آپ ﷺ کی شفقت، رحمت اور عفو و درگزر کا مشاہدہ کر کے اپنی برسوں پرانی دشمنی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

یہ وہ گواہیاں ہیں جو نہ طویل رفاقت کے نتیجے میں وجود میں آئیں، نہ عقیدت کے تدریجی اثر سے نمودار ہوئیں، بلکہ پہلی ہی ملاقات میں دلوں پر ثبت ہونے والے ان نقوش کی آئینہ دار ہیں جنہوں نے دیکھنے والوں کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ ایک غیر معمولی، بے مثال اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں۔

میرے خیال میں یہ موضوع نہایت منفرد اور اثر انگیز ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کی وہ حقیقی تصویر ہے جو عقیدت اور خاص تاثرات کے رنگ سے خالی ہے۔

جن لوگوں نے اپنی پہلی ملاقات کا نسبتاً مکمل اور جذباتی احوال خود بیان کیا ہے، ان میں چند ایک کے تبصرے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں:

اُم معبد رضی اللہ عنہا

اُمّ معبد خزاعیہ ایک باوقار، صاحبِ ہمت اور فیاض خاتون تھیں۔ اس دور میں سفر دشوار گزار، طویل اور خطرات سے بھرپور ہوتے تھے۔ مسافر کئی کئی دن بلکہ ہفتوں بیابانوں میں سفر کرتے، جہاں دور دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ عرب معاشرے میں مسافروں کی مہمان نوازی ایک اعلیٰ اخلاقی وصف اور معاشرتی روایت سمجھی جاتی تھی۔ بعض اہلِ مروّت نے تو مسافروں کی خدمت کے لیے شاہراہوں کے کنارے مستقل خیمے نصب کر رکھے تھے، جہاں آنے جانے والوں کو کھانا، پانی اور آرام کی سہولت فراہم کی جاتی تھی۔ اُمّ معبد بھی ایسے ہی فیاض اور کریم النفس لوگوں میں شامل تھیں۔ ان کا خیمہ شاہراہ پر واقع تھا اور وہ حسبِ استطاعت ہر آنے والے مسافر کی خدمت اور ضیافت کیا کرتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی طرف عازمِ سفر ہوئے تو دوسرے یا تیسرے روز، مکہ سے تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) کلومیٹر کے فاصلے پر مقامِ مُشَلَّل (قدید کے نواح) میں واقع

اُمّ معبد کے خیمے پر تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے ہمراہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ اور راہ نما حضرت عبد اللہ بن اُریقطؓ بھی تھے۔ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اُمّ معبد سے دریافت فرمایا: کیا آپ کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ موجود ہے؟ اس نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا: اللہ کی قسم! اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو آپ کی میزبانی میں ہرگز بخل نہ کرتی۔ اس وقت قحط کا زمانہ ہے، بکریاں چراگاہ میں ہیں اور گھر میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ کی نظر خیمے کے ایک گوشے میں بندھی ہوئی ایک نہایت کمزور بکری پر پڑی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: اے اُمّ معبد! یہ بکری یہاں کیوں رہ گئی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: کمزوری کے باعث یہ ریوڑ کے ساتھ نہیں جا سکی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس میں دودھ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ اس سے بھی زیادہ کمزور ہے کہ دودھ دے سکے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اجازت ہو تو میں اسے دوہ لوں؟ اُمّ معبد نے نہایت ادب سے عرض کیا:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر آپ کو اس میں دودھ کی کوئی امید نظر آتی ہے تو ضرور دوہ لیجیے۔"

رسول اللہ ﷺ نے بکری کے تھن پر اپنا دستِ مبارک پھیرا، اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اس کے لیے دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لمحے اپنی قدرت کا ایسا ظہور فرمایا کہ بکری کے تھن دودھ سے بھر گئے اور وہ مضبوطی سے کھڑی ہو گئی۔ پھر آپ ﷺ نے ایک بڑا برتن منگوایا، جو ایک جماعت کو سیراب کرنے کے لیے کافی تھا اور اس میں اتنا دودھ دوہا کہ برتن جھاگ سے بھر گیا۔ سب سے پہلے اُمّ معبد کو پلایا، یہاں تک کہ وہ خوب سیر ہو گئیں۔ پھر اپنے رفقاء کو پلایا، وہ بھی آسودہ ہو گئے اور آخر میں خود نوش فرمایا۔ اس کے بعد دوبارہ برتن بھر کر دودھ دوہا اور وہ اُمّ معبد کے پاس چھوڑ دیا، پھر قافلہ مدینہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ان کے شوہر، ابو معبد، اپنی بکریاں ہانکتے ہوئے واپس آ گئے۔ گھر میں دودھ سے بھرا برتن دیکھ کر حیران رہ گئے اور پوچھا: اے اُمّ معبد! یہ دودھ کہاں سے آیا؟ گھر میں دودھ دینے والا کوئی جانور تو موجود نہ تھا!

اُمّ معبد نے انہیں تفصیل سے واقعہ سنایا۔ یہ سن کر ابو معبد بولے: "اللہ کی قسم! معلوم ہوتا ہے یہ وہی قریشی شخصیت ہیں جن کی تلاش میں قریش سرگرداں ہیں۔ ذرا ان کے اوصاف تو بیان کرو!۔"

تب اُمّ معبد نے نہایت فصیح، جامع اور دل نشین الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کا سراپا اور شخصیت بیان کی:

رَأَيْتُ رَجُلًا ظَاهِرَ الْوَضَاءَةِ أَبْلَجَ الْوَجْهِ حَسَنَ الْخَلْقِ لَمْ تَعِبْهُ ثُجْلَةٌ، وَلَمْ تُزْرِ بِهِ صَعْلَةٌ وَسِيمٌ فِي عَيْنَيْهِ دَعَجٌ وَفِي أَشْفَارِهِ وَطَفٌ وَفِي صَوْتِهِ صَهَلٌ، وَفِي عُنُقِهِ سَطَعٌ، وَفِي لِحْيَتِهِ كَثَاثَةٌ، أَزَجُّ أَقْرَنُ، إِنْ صَمَتَ فَعَلَيْهِ الْوَقَارُ، وَإِنْ تَكَلَّمَ سَمَاهُ وَعَلَاهُ الْبَهَاءُ، أَجْمَلُ النَّاسِ وَأَبْهَاهُ مِنْ بَعِيدٍ، وأَحْلَاهُ وَأَحْسَنُهُ مِنْ قَرِيبٍ، حُلْوُ الْمَنْطِقِ، فَصْلٌ لَا هَذِرٌ وَلَا تَزِرٌ، كَأَنَّ مَنْطِقَهُ خَرَزَاتُ نَظْمٍ يَتَحَدَّرْنَ، رَبْعٌ لَا يَأْسَ مِنْ طُولٍ، وَلَا تَقْتَحِمُهُ عَيْنٌ مِنْ قِصَرٍ، غُصْنٌ بَيْنَ غُصْنَيْنِ فَهُوَ أَنْضَرُ الثَّلَاثَةِ مَنْظَرًا، وَأَحْسَنُهُمْ قَدْرًا، لَهُ رُفَقَاءُ يَحُفُّونَ بِهِ، إِنْ قَالَ أَنْصَتُوا لِقَوْلِهِ، وَإِنْ أَمَرَ تَبَادَرُوا إِلَى أَمْرِهِ، مَحْفُودٌ مَحْشُودٌ لَا عَابِسٌ وَلَا مُفَنَّدٌ[1].

"میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو نہایت روشن و تابناک چہرے والے تھے۔ ان کا چہرہ کشادہ اور نورانی تھا، جسمانی ساخت خوب صورت اور متناسب تھی۔ نہ موٹاپا ان کے حسن میں خلل ڈالتا تھا اور نہ دبلے پن کے سبب ان کی شخصیت میں کوئی نقص محسوس ہوتا تھا، بلکہ وہ سراپا حسین و جمیل تھے۔

ان کی آنکھیں بڑی، گہری، سیاہ اور نہایت دل کش تھیں، پلکیں لمبی اور گھنی تھیں۔ آواز میں قدرتی بھاری پن اور وقار تھا، گردن بلند، خوب صورت اور چمک دار تھی اور داڑھی گھنی تھی۔ ان کی بھنویں باریک، لمبی اور خوب صورت خم دار تھیں اور ایک دوسرے کے قریب معلوم ہوتی تھیں۔

جب خاموش رہتے تو وقار اور ہیبت ان پر چھائی رہتی، جب گفتگو فرماتے تو ان کا جمال، شان اور رعب و جلال مزید نمایاں ہو جاتا۔ دور سے دیکھنے والا بھی انہیں سب لوگوں سے زیادہ باوقار اور حسین محسوس کرتا اور قریب سے دیکھنے والا ان کی دل کشی، مٹھاس اور حسن کا اور بھی زیادہ معترف ہو جاتا۔

ان کی گفتگو نہایت شیریں، واضح اور فیصلہ کن ہوتی۔ نہ بے جا طویل ہوتی اور نہ اس قدر مختصر کہ مفہوم ادھورا رہ جائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے الفاظ پروئے ہوئے موتیوں کی لڑی ہوں جو نہایت ترتیب اور حسن کے ساتھ ایک ایک کر کے جھڑ رہے ہوں۔

آپ ﷺ کا قد درمیانہ تھا: نہ غیر معمولی لمبا کہ نگاہ کو ناگوار معلوم ہو اور نہ اتنا پست کہ آنکھ اسے

---

1 المعجم الكبير للطبراني (٤/ ٤٨) :٣٦٠٥، دلائل النبوة لأبي نعيم الأصبهاني ،ص: ٣٣٧، رقم الحديث :٢٣٨، تاريخ الطبري :١١/ ٥٧٨

حقیر سمجھے۔ اپنے دو ساتھیوں کے درمیان اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے دو شاخوں کے درمیان ایک سرسبز، شاداب اور خوب صورت شاخ ہو۔ اپنے رفقاء میں سب سے زیادہ حسین، بارونق اور بلند مرتبہ نظر آتے تھے۔

آپ ﷺ کے گرد ساتھی حلقہ بنائے رہتے تھے۔ جب آپ کچھ فرماتے تو سب خاموش ہو کر پوری توجہ سے سنتے اور جب کسی کام کا حکم دیتے تو سب فوراً اس کی تعمیل کے لیے لپک پڑتے۔ آپ ایسے پیشوا تھے جن کی خدمت کے لیے ہر شخص تیار رہتا تھا، آپ ترش رو تھے، نہ کسی کی بات کو حقارت سے رد کرنے والے اور نہ فضول گوئی کرنے والے تھے۔"

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

حضرت سلمان فارسیؓ کا پیدائشی نام مابہ (بعض روایات کے مطابق روزبہ) تھا۔ آپ کا تعلق ایران کے شہر اصفہان کے نواحی علاقے جِی سے تھا۔ ایک معزز مجوسی (آتش پرست) خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اپنے مذہب کے نہایت پکے پیروکار تھے، یہاں تک کہ سلمانؓ کو آتش کدے کی مقدس آگ کی نگہبانی پر مامور کر رکھا تھا اور وہ پوری ذمہ داری سے اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔

ایک روز کسی کام کے لیے گھر سے نکلے تو راستے میں ایک گرجا گھر سے عبادت کی آواز سنائی دی۔ تجسس کے باعث اندر چلے گئے، عیسائیوں کو نہایت خشوع و خضوع سے عبادت کرتے دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ دین، مجوسیت کے مقابلے میں حق کے زیادہ قریب ہے۔ جب گھر واپس آئے تو والد کو سارا واقعہ بتایا۔ والد نے یہ سن کر سخت ناراضی کا اظہار کیا اور انہیں گھر میں زنجیروں سے باندھ دیا تاکہ دوبارہ عیسائیوں کے پاس نہ جا سکیں۔

ایک دن موقع پا کر سلمانؓ نے بیڑیاں توڑ دیں اور شام جانے والے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ شام پہنچ کر دریافت کیا کہ یہاں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ لوگوں نے ایک راہب کا پتا بتایا۔ سلمانؓ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے، عیسائیت اختیار کی اور اس کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے لگے۔

جب وہ راہب وفات پا گیا تو اس کی وصیت کے مطابق موصل گئے، پھر نصیبین اور وہاں سے عموریہ پہنچے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرے ایسے عالم کی صحبت اختیار کرتے رہے جس کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کی باقی ماندہ تعلیمات پر قائم ہے۔ آخر کار عموریہ کے عالم کی وفات کا وقت آیا تو سلمانؓ نے عرض کیا: "آپ مجھے کس کے پاس جانے کی وصیت کرتے ہیں؟" اس نے جواب دیا:

"آج روئے زمین پر مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جو دین حنیف کی اصلی تعلیمات پر قائم ہو۔ البتہ

اب آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔ وہ سرزمینِ عرب میں مبعوث ہوں گے، دینِ ابراہیم کو زندہ کریں گے اور کھجوروں والی سرزمین کی طرف ہجرت کریں گے۔ ان کی چند نمایاں نشانیاں یہ ہیں: وہ ہدیہ قبول کریں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے اور ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی۔ اگر تم ان تک پہنچ سکو تو ضرور پہنچنا۔"

یہ بشارت سن کر سلمانؓ کا دل سرزمینِ عرب کی طرف کھنچ گیا، مگر وہاں پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد بنو کلب کے چند عرب تاجر وہاں آئے۔ سلمانؓ نے ان سے کہا:

"اگر تم مجھے عرب میں پہنچا دو تو میں اپنی تمام گائیں اور بکریاں تمہیں دے دوں گا۔"

وہ بظاہر راضی ہو گئے، مگر وادیُ القریٰ پہنچ کر انھوں نے سلمان کو ایک یہودی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

وادیُ القریٰ میں کھجوروں کے باغات دیکھ کر سلمانؓ کے دل میں امید کی ایک کرن جاگی کہ شاید یہی وہ سرزمین ہے جس کی خبر عیسائی عالم نے دی تھی۔ بعد ازاں اس یہودی کا ایک رشتہ دار مدینہ منورہ سے آیا اور سلمانؓ کو خرید کر اپنے ساتھ مدینہ لے گیا۔

مدینہ پہنچ کر جب کھجوروں کے باغات اور دیگر علامات دیکھیں تو امید پھر تازہ ہو گئی کہ شاید یہی وہ بابرکت سرزمین ہے جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی انتظار میں دن گزارنے لگے۔

ادھر مکہ مکرمہ میں آفتابِ رسالت طلوع ہو چکا تھا، لیکن غلامی کی زندگی میں مشغول سلمانؓ اس عظیم خبر سے بے خبر تھے۔ حضرت سلمانؓ خود بیان کرتے ہیں:

"ایک دن میں کھجور کے ایک درخت پر چڑھا ہوا کام کر رہا تھا اور میرا آقا نیچے بیٹھا تھا کہ اچانک اس کا ایک رشتہ دار آیا اور کہنے لگا: 'اللہ، بنی قیلہ (انصار) کو ہلاک کرے! وہ سب اس وقت قبا میں ایک ایسے شخص کے گرد جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور لوگ اسے نبی سمجھتے ہیں۔ یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میرا جسم کانپ اٹھا۔ خوشی اور اضطراب کے عالم میں قریب تھا کہ درخت سے نیچے گر پڑتا۔ فوراً اتر کر اس آدمی سے بے اختیار پوچھا: "تم کیا کہہ رہے ہو؟" یہ سن کر آقا نے غصے میں ایک زور کا گھونسا مارا اور ڈانٹتے ہوئے کہا: "تمہیں اس سے کیا غرض؟ اپنا کام کرو!"

سلمانؓ خاموش ہو گئے، شام ہونے کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ کام سے فارغ ہوئے تو اپنے پاس موجود کچھ کھانے کی چیزیں جمع کیں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ غریب اور ضرورت

مند لوگ بھی ہیں۔ یہ چند چیزیں میں صدقہ کی نیت سے لایا ہوں۔ میرے خیال میں آپ لوگوں سے بڑھ کر اس کے مستحق کوئی نہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے وہ کھانا صحابۂ کرام کو دے دیا، لیکن خود اس میں سے کچھ تناول نہ فرمایا۔

سلمانؓ کہتے ہیں: "میں نے دل میں کہا: پہلی نشانی پوری ہو گئی۔"

چند روز بعد وہ دوبارہ کچھ کھانے کی چیزیں لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "پچھلی مرتبہ میں صدقہ لایا تھا، آپ نے اس میں سے نہیں کھایا تھا۔ آج یہ ہدیہ ہے، اسے قبول فرمائیے۔"

اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہدیہ قبول فرمایا، خود بھی تناول فرمایا اور صحابۂ کرامؓ کو بھی کھلایا۔

سلمانؓ فرماتے ہیں: "میں نے دل میں کہا: دوسری نشانی بھی پوری ہو گئی۔"

پھر ایک دن حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ سلمانؓ اس امید میں آپ ﷺ کے گرد چکر لگانے لگے کہ کسی طرح مہرِ نبوت دیکھ سکوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی کیفیت بھانپ لی تو اپنی چادر مبارک کو قصداً اس طرح ہٹایا کہ دونوں کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت نمایاں ہو گئی۔ جونہی سلمانؓ کی نظر اس مبارک مہر پر پڑی، وہ بے اختیار آگے بڑھے، اس پر جھک گئے، اسے بوسہ دیا اور شدتِ مسرت سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ برسوں کے متلاشی کو منزل مل گئی تھی اور حق کے متلاشی کا سفر اپنے حقیقی مقصود تک پہنچ چکا تھا[1]۔

عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہود کے جلیل القدر عالم تھے۔ آپ کا نام حصین تھا، والد کا نام سلام اور دادا کا نام حارث ہے، کنیت ابو یوسف ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کا اسلامی نام عبد اللہ تجویز کیا۔ عبد اللہ بن سلام بہت خوبصورت اور وجیہ جوان تھے[2]۔ آپ رضی اللہ عنہ کا شجرہ نسب اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملتا ہے، اسی عالی نسبت اور خاندانی شرافت کی وجہ سے آپ یہود کے ہاں مسلّمہ روحانی شخصیت تصور کیے جاتے تھے اور دور دراز کے علاقوں سے یہودی آپ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔

جب انہوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے ہیں تو وہ اپنے علم کی بنیاد

1　مسند أحمد (۳۹/۱۴۰): ۲۳۷۳۷

2　صحیح مسلم: ۲۴۸۴

پر تحقیق کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ المَدِينَةَ انْجَفَلَ النَّاسُ إِلَيْهِ، وَقِيلَ: قَدِمَ رَسُولُ الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجِئْتُ فِي النَّاسِ لِأَنْظُرَ إِلَيْهِ، فَلَمَّا اسْتَبَنْتُ وَجْهَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَفْتُ أَنَّ وَجْهَهُ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ.

"جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ آپ کے استقبال کے لیے یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ بڑھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ آپ کو دیکھنے کے لیے آیا، جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

"سب سے پہلی بات جو (میں نے سنی) آپ ﷺ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُونَ الجَنَّةَ بِسَلَامٍ.[1]

"اے لوگو! سلام کو عام کرو (یعنی ہر ایک کو سلام کرو)، کھانا کھلاؤ، نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں (یعنی نماز تہجد پڑھو)، تو آسانی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

پھر اگلے دن حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے چند ایک سوال کیے، وہ فرماتے ہیں:

إِنِّي سَائِلُكَ عَنْ ثَلَاثٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا نَبِيٌّ قَالَ: مَا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ؟ وَمَا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الجَنَّةِ؟ وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ الوَلَدُ إِلَى أَبِيهِ؟ وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ إِلَى أَخْوَالِهِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَبَّرَنِي بِهِنَّ آنِفًا جِبْرِيلُ، قَالَ: فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ ذَاكَ عَدُوُّ اليَهُودِ مِنَ المَلَائِكَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ المَشْرِقِ إِلَى المَغْرِبِ، وَأَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ حُوتٍ، وَأَمَّا الشَّبَهُ فِي الوَلَدِ: فَإِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَشِيَ المَرْأَةَ فَسَبَقَهَا مَاؤُهُ كَانَ الشَّبَهُ لَهُ، وَإِذَا سَبَقَ مَاؤُهَا كَانَ الشَّبَهُ لَهَا . قَالَ: أَشْهَدُ

---

1 سنن ترمذی: ۲۴۸۵، الطبقات الکبری: (۱/۱۸۱)

أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ۔ [1]

"میں نے عرض کی: میں آپ سے تین سوالات پوچھنا چاہتا ہوں، جن کے جواب نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا: (۱) قیامت کی سب سے پہلی نشانی کیا ہے؟ (۲) اہل جنت سب سے پہلے کونسا کھانا کھائیں گے؟ (۳) کس وجہ سے بچہ کبھی اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی اپنے ماموؤں کی مشابہت اختیار کرلیتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: ابھی ابھی مجھے جبریل نے ان کے متعلق بتایا ہے۔ عبداللہ بن سلام کہنے لگے: وہ فرشتہ تو قوم یہود کا دشمن ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا:

① "قیامت کی پہلی نشانی آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک لے جائے گی۔

② اہل جنت سب سے پہلے جو کھانا تناول فرمائیں گے وہ مچھلی کے جگر کے ساتھ کا بڑا ہوا ٹکڑا ہوگا۔

③ بچے کی مشابہت اس طرح ہوتی ہے کہ جب مرد بیوی سے جماع کرتا ہے تو اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجائے تو بچہ باپ کے مشابہ ہوتا اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت لے جائے تو بچہ عورت کے مشابہت ہو جاتا ہے"۔

تب عبداللہ کو سلام (کو یقین آگیا تو انہوں) نے کہا: أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں)۔"

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ

حضرت عدی بن حاتمؓ کی کنیت ابو ظریف اور بعض اہل سیر کے نزدیک ابو وہب تھی۔ آپ عرب کے مشہور سخی "حاتم طائی" کے فرزند اور قبیلہ طئی کے موروثی سردار تھے۔ ابتدا میں بت پرست تھے اور اپنے قبیلے کے معبود "فُلس" کی عبادت کرتے تھے، لیکن جب اس کی بے بسی اور بے اختیاری کا یقین ہوا تو بت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کرلی۔ قبیلے کی سرداری کے باعث آپ اپنی قوم کی غنیمت سے چوتھا حصہ وصول کرتے تھے اور اسے اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ اسلام جب جزیرۂ عرب میں پھیلنے لگی اور یکے بعد دیگرے اسلام کو فتوحات حاصل ہونے لگیں تو عدی بن حاتمؓ شدید اضطراب کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف قبیلے کی سرداری اور اقتدار کا غرور انہیں اسلام قبول کرنے سے روکتا تھا اور دوسری طرف انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس دعوت کا راستہ اب

---

1 صحیح بخاری: ۳۳۲۹

روکا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور نفرت بڑھتی چلی گئی۔

حضرت عدیؓ خود اپنی داستان ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

میں اپنی قوم کا سردار تھا۔ جب میں نے محمد ﷺ کی نبوت کی خبر سنی تو پورے عرب میں شاید ہی کوئی شخص مجھ سے زیادہ آپ سے نفرت کرتا ہو۔ میں عیسائی مذہب کا پیروکار تھا اور اپنے آپ کو بڑا دیندار سمجھتا تھا۔ جوں جوں رسول اللہ ﷺ کی کامیابیوں کی خبریں پہنچتیں، میری دشمنی اور نفرت میں اضافہ ہوتا جاتا۔"

اسی اندیشے کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ چند عمدہ اور تیز رفتار اونٹنیاں ہر وقت تیار رکھے تاکہ اگر مسلمانوں کا لشکر ان کے علاقے کی طرف بڑھے تو فوراً شام کی طرف نکل جائیں۔

ایک دن غلام گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا:

"اے عدی! اگر اپنی جان بچانی ہے تو اب دیر نہ کیجیے۔ میں نے محمد ﷺ کے لشکر کے جھنڈے ہمارے علاقے کی طرف بڑھتے دیکھے ہیں۔"

یہ سنتے ہی انہوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو اونٹنیوں پر سوار کیا اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، مگر جلد بازی میں اپنی بہن "سفانہ بنت حاتم" کو وہیں چھوڑ گئے۔

ان کے روانہ ہونے کے بعد مسلمانوں کے لشکر نے قبیلہ طی کو مغلوب کر لیا اور بہت سے افراد قیدی بنا لیے، جن میں "سفانہ" بھی شامل تھیں۔ انہیں مدینہ منورہ لایا گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے والد حاتم طائی کی سخاوت اور اپنی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے رہائی کی درخواست کی۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف انہیں آزاد فرمایا بلکہ عزت و احترام کے ساتھ سامانِ سفر دے کر رخصت کیا۔

سفانہ شام پہنچیں تو بھائی سے نہایت شکوہ کیا اور کہا:

"تم اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے گئے، مگر اپنی بہن کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔"

عدیؓ نے خاموشی سے ساری ملامت سنی، معذرت کی، تو سفانہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر انہوں نے کہا:

"بھائی! میری رائے ہے کہ محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ اگر وہ واقعی اللہ کے نبی ہیں تو ان پر ایمان لانے میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی سعادت ہے اور اگر وہ ایک فرمانروا ہیں تو بھی تم حاتم طائی کے بیٹے ہو، وہ تمہاری عزت کریں گے۔"

بہن کا یہ مخلصانہ مشورہ عدیؓ کے دل میں اتر گیا۔ انہوں نے سوچا کہ ایک مرتبہ خود جا کر حقیقت معلوم

کرنی چاہیے۔ اگر وہ سچے نبی ہوئے تو ان کی پیروی اختیار کروں گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے کوئی نقصان نہ ہو گا۔
چنانچہ وہ شام سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔

حضرت عدیؓ بیان کرتے ہیں:

"جب میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے درمیان تشریف فرما تھے۔
لوگوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! یہ عدی بن حاتم ہیں"۔ میں بغیر کسی امان نامے یا معاہدے کے
حاضر ہوا تھا۔"

رسول اللہ ﷺ نے بڑی شفقت سے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک ضعیف عورت اپنے ایک بچے کے ساتھ حاضر ہوئی اور عرض کیا:

"یارسول اللہ! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

آپ ﷺ فوراً رک گئے۔ نہایت توجہ اور تحمل کے ساتھ اس کی پوری بات سنی، اس کی ضرورت پوری کی، پھر عدیؓ کو ساتھ لے کر آگے بڑھے۔

عدیؓ کہتے ہیں: "میں نے دل ہی دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ کسی بادشاہ کا طریقہ نہیں ہو سکتا۔"

گھر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا ایک تکیہ میری طرف بڑھایا اور فرمایا:

"اس پر بیٹھ جاؤ"۔

میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! آپ اس پر تشریف رکھیں"۔

مگر آپ ﷺ نے مجھے تکیے پر بٹھایا اور خود زمین پر تشریف فرما ہو گئے۔

میں نے دل میں کہا: " اللہ کی قسم! یہ کسی دنیادار بادشاہ کی شان نہیں، بلکہ اللہ کے نبی کی شان ہے۔"

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اے عدی! کیا تم اس لیے اسلام سے دور ہو کہ 'لا إله إلا الله' کہنا تمہیں گوارا نہیں؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبودِ برحق ہے؟"

میں نے عرض کیا: "نہیں۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

"کیا تم اس لیے بھاگ رہے ہو کہ 'اللہ اکبر' کہنا پڑے؟ کیا اللہ سے بڑھ کر بھی کوئی اور ہستی ہے؟"

میں نے عرض کیا: "ہرگز نہیں۔"

پھر فرمایا: "اے عدی! اسلام قبول کر لو، تم محفوظ ہو جاؤ گے۔"
میں نے کہا: "میں تو ایک دیندار آدمی ہوں۔"
آپ ﷺ نے فرمایا:
"میں تمہارے دین کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ کیا تم رَکُوسی نہیں ہو؟ اور کیا تم اپنی قوم کی غنیمت کا چوتھا حصہ وصول نہیں کرتے ہو، حالانکہ تمہارے مذہب میں یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے؟"
یہ سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا، کیونکہ یہ بات میرے اور میری قوم کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی وقت مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ غیب کی خبریں عطا فرماتا ہے۔"
اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"شاید تمہیں مسلمانوں کی غربت اسلام قبول کرنے سے روک رہی ہے۔ اللہ کی قسم! وہ وقت دور نہیں جب مال اس قدر عام ہو گا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ملے گا۔ شاید تم مسلمانوں کی کمزوری دیکھ کر رکے ہوئے ہو، عنقریب وہ وقت آئے گا جب ایک عورت تنہا حیرہ سے مکہ تک سفر کرے گی اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو گا۔ اور عنقریب کسریٰ بن ہرمز کے خزانے مسلمانوں کے قبضے میں ہوں گے۔"
عدیؓ نے تعجب سے پوچھا: "کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟"
آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، کسریٰ بن ہرمز کے خزانے۔"
ان دل نشین گفتگوؤں، بے مثال اخلاق، عاجزی، حسنِ سلوک اور ان غیبی خبروں نے میرے دل کی تمام تاریکیاں دور کر دیں۔ میں نے فوراً عرض کیا:

'أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أنك رسول الله'.

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ انور خوشی سے دمک اٹھا۔ اور آپ نے مجھے ایک انصاری صحابی کے ہاں مہمان ٹھہرایا[1]۔

ضماد الازدی رضی اللہ عنہ

حضرت ضِماد بن ثعلبہ الازدیؓ کا تعلق عرب کے معروف قبیلہ اَزدِ شنوءہ سے تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ طبابت اور جراحی کے ماہر تھے۔ اس کے ساتھ وہ دم جھاڑ بھی کرتے تھے، خصوصاً جنون اور آسیب کے علاج میں ان کی

1 طبقات لابن سعد: ۱/ ۶۴۴:۲۹۱

بڑی شہرت تھی۔ لوگ دور دراز علاقوں سے ان کے پاس علاج کی غرض سے آتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ضمادؓ حج یا عمرے کی غرض سے مکہ مکرمہ آئے۔ وہاں قریش کے لوگوں سے سنا کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) جنون میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے دل میں سوچا کہ چونکہ میں اس مرض کا علاج جانتا ہوں، اس لیے مناسب ہے کہ محمد ﷺ سے مل کر انہیں دم کروں، شاید اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں انہیں شفا عطا فرما دے۔

اسی خیال کے تحت وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"اے محمد! میں جنون اور آسیب کے مریضوں پر دم کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے میرے ہاتھوں شفا عطا فرما دیتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو بھی دم کر دوں۔"

رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات سن کر نہ غصے کا اظہار فرمایا، نہ ملامت کی اور نہ ہی ان کی جہالت کا مذاق اڑایا، بلکہ نہایت وقار، شفقت اور حکمت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ، نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ.

"یقیناً تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ چھوڑ دے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اما بعد۔"

ضمادؓ صاحبِ فہم، حکیم اور زبان و بیان کے رموز سے آشنا تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ مبارک کلمات سنتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ کسی عام انسان کا کلام نہیں۔ ان کے معانی کی گہرائی، الفاظ کی جامعیت اور بیان کی تاثیر نے ان کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

انہوں نے بے اختیار عرض کیا: "یہ کلمات ایک مرتبہ پھر سنائیے۔"

رسول اللہ ﷺ نے وہی خطبہ تین مرتبہ دہرایا۔ یہ سن کر ضمادؓ پکار اٹھے:

"میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام بہت سنا ہے، مگر اللہ کی قسم! آپ کے ان کلمات جیسا کلام کبھی نہیں سنا۔ یہ تو فصاحت و بلاغت کے سمندر کی انتہائی گہرائی تک پہنچا ہوا کلام ہے۔"

پھر عرض کیا: "اپنا دستِ مبارک بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرتا ہوں۔"

چنانچہ اسی پہلی ملاقات میں وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے![1]

یہ واقعہ اس حقیقت کا روشن ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے چند جملوں نے ایک اہلِ علم، صاحبِ ذوق اور ماہر فن انسان کے دل کی دنیا بدل دی، یہاں تک کہ وہ چند لمحوں میں اسلام کے حلقۂ بگوش ہو گئے۔

عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

عروہ بن مسعود بن معتب، قبیلۂ ثقیف کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ طائف کے بڑے سرداروں میں شمار ہوتے تھے اور اپنی دانائی، قیادت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے عرب میں معروف تھے۔ عربوں میں ان کے مقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قریش سمجھتے تھے کہ اگر اللہ کو نبی بنانا ہوتا تو (محمد ﷺ کی بجائے) مکہ کے ولید بن مغیرہ کو بناتا یا طائف کے عروہ بن مسعود کو۔

سنہ ۶ ہجری میں جب رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کرنے کا پروگرام بنایا اور صحابہ کرام کو لے کر مکہ کی جانب عازم سفر ہوئے۔ مکہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ مکہ والوں نے آپ کا راستہ روکنے کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ذریعے قریش کو صلح کا پیغام بھیجا۔ سرداران قریش اس پر غور و خوض کر رہے تھے اور عروہ بن مسعود بھی ان دنوں کسی غرض سے مکہ آئے ہوئے تھے اور اس مجلس میں موجود تھے، کہنے لگے:

میری قوم کے لوگو! کیا تم اولاد کی طرح (میرے خیر خواہ) اور میں تم پر باپ کی طرح شفقت نہیں کرتا؟ انھوں نے کہا: ہاں، کیوں نہیں۔ عروہ نے کہا: کیا تم مجھ پر کوئی الزام لگاتے ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ عروہ نے کہا: اگر تم چاہو میں جا کر محمد سے بات کروں؟ قریش نے اجازت دے دی۔

عروہ قریش کے سفیر کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بات چیت کی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ ﷺ سے محبت، ادب اور اطاعت کا منظر دیکھا تو واپس جا کر قریش سے کہا:

"اللہ کی قسم! میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں اور قیصر و کسریٰ، نیز نجاشی کے دربار بھی دیکھ آیا ہوں مگر میں نے کسی بادشاہ کو ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں جس

1 صحیح مسلم:۸۶۸

طرح محمد ﷺ کے اصحاب ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! جب وہ تھوکتے ہیں تو ان میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ پر پڑتا ہے اور وہ اس کو اپنے چہرے پر مل لیتا ہے۔ اور جب وہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر وہ وضو کرتے ہیں تو لوگ ان کے وضو سے بچے ہوئے پانی کے لیے لڑتے مرتے ہیں۔ جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کے سامنے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں اور تعظیم کی وجہ سے ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتے۔ بے شک انھوں نے تمھیں ایک اچھی بات کی پیش کش کی ہے۔ (میرا مشورہ ہے کہ) تم اسے قبول کرلو[1]۔"

غور کریں، عروہ بن مسعود اس وقت مسلمان نہیں تھے، اس لیے ان کی یہ گواہی ایک غیر مسلم، غیر جانب دار اور بااثر عرب سردار کی شہادت ہے۔ انہوں نے دنیا کے عظیم حکمرانوں (قیصر، کسریٰ اور نجاشی) کے دربار دیکھنے کے باوجود بلکہ ان کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے۔

ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ

حضرت ثُمامہ بن اُثال حنفی قبیلہ بنو حنیفہ کے سربراہ اور یمامہ (موجودہ ریاض کے علاقے) کے بااثر حکمران تھے۔ عرب کے دیگر قبائلی سرداروں کی طرح وہ بھی اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے سخت مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق وہ عمرے کی نیت سے مکہ جارہے تھے، جبکہ بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تھے۔

راستے میں حضرت محمد بن مسلمہؓ کی قیادت میں ایک غزوہ سے واپس آنے والے اسلامی دستے نے انہیں گرفتار کرلیا۔ صحابۂ کرامؓ انہیں مدینہ منورہ لائے اور مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا تاکہ رسول اللہ ﷺ خود ان کے بارے میں فیصلہ فرمائیں۔

اگلی صبح رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور نہایت اطمینان سے دریافت فرمایا:

"اے ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے؟"

ثُمامہ نے اپنی قبائلی نخوت اور سخت لہجے میں جواب دیا:

عِنْدِي خَيْرٌ يَا مُحَمَّدُ، إِنْ تَقْتُلْنِي تَقْتُلْ ذَا دَمٍ، وَإِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلَى شَاكِرٍ، وَإِنْ كُنْتَ تُرِيدُ الْمَالَ فَسَلْ مِنْهُ مَا شِئْتَ

---

1 صحیح بخاری: ۲۷۳۱-۲۷۳۲

"اے محمد! میرے پاس خیر ہی خیر ہے۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کے خون کا بدلہ لیا جائے گا، اور اگر احسان کر کے مجھے چھوڑ دیں گے تو ایک قدردان شخص پر احسان کریں گے، اور اگر مال مطلوب ہے تو جتنا چاہیں طلب کر لیجیے۔"

رسول اللہ ﷺ نے اس قدر سخت اور گستاخانہ جواب پر بھی کوئی ناگواری ظاہر نہ فرمائی، نہ کوئی جواب دیا، بلکہ خاموشی سے تشریف لے گئے۔

دوسرے دن پھر آپ ﷺ بنفسِ نفیس ان کے پاس تشریف لائے، خیریت دریافت کی، مگر ثمامہ نے وہی جواب دہرایا۔ تیسرے دن بھی یہی منظر دہرایا گیا۔ نہ رسول اللہ ﷺ کے لہجے میں کوئی تبدیلی آئی، نہ ثمامہ کے جواب میں کوئی فرق۔

آخر کار تیسرے دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

"ثُمامہ کو آزاد کر دو۔"

یہ فیصلہ ثمامہ کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ان چند دنوں میں مسجدِ نبوی کا ماحول، رسول اللہ ﷺ کا حسنِ اخلاق، صحابہ کرامؓ کی عبادت، نظم و ضبط، باہمی محبت اور ایک قیدی کے ساتھ ان کے حسنِ سلوک کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ جس شخص کے قتل کے ارادے سے وہ نکلے تھے، اس نے نہ ان سے انتقام لیا، نہ فدیہ طلب کیا، نہ سختی کی، بلکہ بلا کسی شرط کے آزاد کر دیا۔

آزادی کے بعد وہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے باغ میں گئے، غسل کیا اور فوراً مسجدِ نبوی واپس آئے۔ حاضر ہو کر بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام قبول کر لیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر نہایت رقت آمیز انداز میں عرض کیا:

يَا مُحَمَّدُ، وَاللَّهِ مَا كَانَ عَلَى الْأَرْضِ وَجْهٌ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ وَجْهِكَ، فَقَدْ أَصْبَحَ وَجْهُكَ أَحَبَّ الْوُجُوهِ إِلَيَّ، وَاللَّهِ مَا كَانَ مِنْ دِينٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ دِينِكَ، فَأَصْبَحَ دِينُكَ أَحَبَّ الدِّينِ إِلَيَّ، وَاللَّهِ مَا كَانَ مِنْ بَلَدٍ أَبْغَضُ إِلَيَّ مِنْ بَلَدِكَ، فَأَصْبَحَ بَلَدُكَ أَحَبَّ الْبِلَادِ إِلَيَّ.[1]

"اے محمد! اللہ کی قسم! روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چہرہ مجھے ناپسند نہ تھا، مگر آج آپ

1 صحیح بخاری: ۴۳۷۲، صحیح مسلم: ۱۷۶۴

کا چہرہ مجھے تمام چہروں سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ اللہ کی قسم! آپ کے دین سے بڑھ کر کوئی دین مجھے ناپسند نہ تھا، مگر آج آپ کا دین مجھے تمام ادیان سے زیادہ محبوب ہے۔ اور اللہ کی قسم! آپ کے شہر سے بڑھ کر کوئی شہر مجھے ناپسند نہ تھا، مگر آج آپ کا شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ "

یہ الفاظ محض ایک نو مسلم کے جذبات نہ تھے، بلکہ اس قلبی انقلاب کی سچی ترجمانی تھے جو رسول اللہ ﷺ کے حسنِ اخلاق، حلم، عفو و درگزر اور بے مثال کردار نے ایک سخت ترین دشمن کے دل میں برپا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنی کی انتہا سے محبت کی معراج تک کا یہ سفر صرف تین دن میں طے ہو گیا۔

طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ

حضرت طفیل بن عمرو دَوسیؓ قبیلۂ دَوس کے نامور سردار، ممتاز شاعر، زیرک سیاست دان اور نہایت صاحبِ عقل و فراست شخصیت تھے۔ ان کا لقب ذوالنور تھا۔ یمن کے بعض علاقوں میں ان کے قبیلے کو نیم خود مختار حیثیت حاصل تھی، اس لیے عرب قبائل میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

نبوت کے گیارہویں سال وہ حج عمرے یا کسی دوسری ضرورت کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ قریش نے ان کا پرتپاک استقبال کیا، مگر ساتھ ہی انہیں رسول اللہ ﷺ سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا:

"اے طفیل! آپ ہمارے شہر میں تشریف لائے ہیں، لیکن یہاں ایک شخص نے ہمیں شدید آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے ہماری جماعت کو منتشر کر دیا ہے، ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور خاندانوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اس کی باتوں میں ایسا سحر ہے کہ وہ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، حتیٰ کہ میاں بیوی کے درمیان بھی جدائی ڈال دیتا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں آپ اور آپ کی قوم بھی اس فتنے کا شکار نہ ہو جائیں، اس لیے خبردار! نہ اس سے بات کیجیے اور نہ اس کی کوئی بات سنیے۔ "

حضرت طفیلؓ خود اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قریش برابر مجھے ڈراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ محمد ﷺ سے گفتگو کروں گا نہ ان کی کوئی بات سنوں گا۔ اگلی صبح جب مسجد حرام جانے لگا تو میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تاکہ ان کی آواز کا ایک لفظ بھی میرے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ "

لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حضرت طفیلؓ کہتے ہیں:

"میں مسجد حرام پہنچا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے قریب نماز ادا فرما رہے ہیں۔ میں آپ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ باوجود اس کے کہ میں نے اپنے کان بند کر رکھے تھے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ

کے مبارک کلمات میں سے کچھ میرے کانوں تک پہنچ جائیں۔ جب میں نے کلام سنا، تو وہ نہایت دل نشین اور پر اثر تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا:

"میری ماں مجھ پر روئے! میں ایک سمجھ دار آدمی اور شاعر ہوں۔ اچھے اور برے کلام میں امتیاز کر سکتا ہوں۔ آخر مجھے کیا چیز روکتی ہے کہ اس شخص کی بات پوری طرح سن لوں؟ اگر وہ حق ہو تو قبول کر لوں اور اگر باطل ہو تو رد کر دوں۔"

یہ سوچ کر میں وہیں ٹھہر گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور اجازت لے کر اندر داخل ہو گیا۔ عرض کیا:

"اے محمد! آپ کی قوم نے میرے سامنے آپ کے متعلق بہت سی باتیں بیان کیں۔ انہوں نے مجھے اس قدر ڈرایا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی تک ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی بات نہ سن سکوں، مگر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کا کچھ کلام میرے کانوں تک پہنچے اور میں نے اسے نہایت عمدہ پایا۔ اب آپ مجھے اپنا دین پیش کیجیے۔"

رسول اللہ ﷺ نے نہایت شفقت سے انہیں اسلام کی دعوت دی، اللہ تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی اور قرآنِ مجید کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔

حضرت طفیلؓ کہتے ہیں:

اللہ کی قسم! میں نے اس سے زیادہ حسین کلام کبھی نہیں سنا تھا اور نہ اس سے بڑھ کر معتدل، پاکیزہ اور حکیمانہ دین دیکھا تھا۔"

اسی مجلس میں انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام قبول کر لیا۔

حضرت طفیلؓ کی یہ پہلی ملاقات اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ قریش کے برسوں کے پروپیگنڈے کو رسول اللہ ﷺ کے چند مبارک جملے اور قرآنِ کریم کی چند آیات لمحہ بھر میں بے اثر کر گئیں۔ جس شخص نے اپنے کانوں میں روئی اس لیے ٹھونسی تھی کہ کہیں محمد ﷺ کی آواز نہ سن لے، وہی چند لمحوں بعد آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے آپ کا جاں نثار ساتھی بن گیا۔[1]

---

1 سیرت النبی لابن ہشام: ۱/ ۳۸۶-۳۸۷

ایک بدو کا قبول اسلام

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو بھی شخص اسلام قبول کرتا اور رسول اللہ ﷺ سے مال طلب کرتا، آپ اسے ضرور عطا فرماتے۔ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے دو پہاڑوں کے درمیان (وادی میں چرنے والی) بکریوں کا ایک ریوڑ عطا کر دیا۔ جب وہ شخص اپنی قوم کے پاس پہنچا تو انہیں کہنے لگا:

يَا قَوْمِ أَسْلِمُوا، فَإِنَّ مُحَمَّدًا يُعْطِي عَطَاءً لَا يَخْشَى الْفَاقَةَ .[1]

"اے میری قوم! اسلام قبول کرلو، کیونکہ محمد ﷺ اتنا زیادہ مال دیتے ہیں کہ پھر فقر و فاقہ کا کوئی ڈر نہیں رہتا۔"

حاصل مطالعہ

ویسے تو جو بھی شخص رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرتا تھا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا، لیکن اس مضمون میں صرف ان چند ایک شخصیات کا تذکرہ بطور نمونہ پیش کیا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی پہلی ملاقات کے احوال بیان کیے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی پہلی ملاقاتوں کے واقعات کو محفوظ رکھا، محدثین و سیرت نگاروں نے انہیں روایت کیا، تاکہ آنے والی امت یہ جان سکے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں وہ کون سی صفات تھیں جنہوں نے دلوں کو مسخر کر لیا اور دشمنوں کو بھی دوست بنا دیا۔ ان تاثرات سے رسول اللہ ﷺ کے حسنِ اخلاق، نورانیت، وقار، شفقت اور دعوت کے اسلوب کی حقیقی جھلک ملتی ہے، جنہیں ہم کافروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ان ملاقاتوں سے دعوتِ دین کے داعیوں کے لیے قیمتی اسباق ملتے ہیں کہ ایک داعی کی مسکراہٹ، حسنِ استقبال، نرم گفتگو، صبر، شفقت اور اخلاص بعض اوقات طویل تقاریر سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

آج امتِ مسلمہ کو بھی اسی سیرتِ طیبہ سے رہنمائی لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے حسنِ اخلاق، نرم مزاجی، عدل، شفقت، حکمت اور خیر خواہی کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو نہ صرف ہماری انفرادی زندگی سنور سکتی ہے بلکہ معاشرے میں محبت، اخوت اور دین کی صحیح دعوت بھی عام ہو سکتی ہے۔

---

1 صحیح مسلم: ۲۳۱۲

عقائدی اختلافات کی الجھن اور اعتدال کا راستہ

شیخ عبدالحی یوسف[1]

ترجمانی: طاہر اسلام عسکری

عقائدی مباحث امت کے علمی تراث کا اہم حصہ ہیں لیکن جب یہ مباحث سنجیدہ علمی حلقوں کے بجائے سوشل میڈیا کی تند و تیز فضا میں زیرِ بحث آتے ہیں تو طلبہ، عام قارئین اور دین سے وابستہ مخلص افراد کے لیے الجھن، بدگمانی اور اضطراب کا سبب بن جاتے ہیں؛ خصوصاً اشاعرہ، اہلِ حدیث اور دیگر اہلِ قبلہ کے مابین پائے جانے والے بعض علمی اختلافات کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے ایمان کی حلاوت، قرآن سے تعلق اور طلبِ علم کا ذوق متاثر ہوتا ہے۔

زیرِ نظر فتویٰ اسی اہم اور نازک مسئلے پر ایک متوازن رہ نمائی پیش کرتا ہے۔ اس میں اختلافی مباحث کے آداب، ایمان کی حفاظت، عقیدہ سیکھنے کے صحیح منہج، دعا، تدبرِ قرآن، صحبتِ صالحین اور علمی اعتدال کی طرف نہایت حکیمانہ انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ افادۂ عام کے پیشِ نظر اس کا اردو ترجمہ شایع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین عقائدی مباحث میں سنجیدگی، وقار، وسعتِ نظر اور دینی ترجیحات کا صحیح شعور حاصل کر سکیں۔ ادارہ

سوال سوشل میڈیا اور احباب کی مجالس میں اشاعرہ اور سلفیہ، یعنی اہلِ حدیث، کے مابین عقائدی اختلافات اس قدر پھیل گئے ہیں کہ میں انتشارِ فکر میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس کا اثر میرے طلبِ علم اور تدبرِ قرآن پر بھی پڑ رہا ہے۔ میں ان اختلافات سے کس طرح نکلوں تاکہ میرا ایمان متاثر نہ ہو؟ مزید یہ کہ عقیدہ سیکھنے کا درست طریقہ کیا ہے؟ کن مرکزی باتوں پر توجہ دینی چاہیے اور کن جزوی مباحث میں پڑنے سے بچنا چاہیے؟

جواب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد:

میرے بھائی! میں آپ کو چند باتوں کی نصیحت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ انھیں یاد رکھیں گے اور

[1] رئیس، الیکٹرانک دار الافتاء، مرکز أنصار النبی ﷺ للفتویٰ والإرشاد

مضبوطی سے تھامے رہیں گے۔

اوّل: نبی کریم ﷺ کی اس دعا کا اہتمام کیجیے:

اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ، اهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ؛ إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ.

"اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، غیب و حاضر کے جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے۔ اپنے اذن سے مجھے اس حق کی رہ نمائی فرما جس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ بے شک تو جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔"

اسی طرح قرآن کی اس دعا کو بھی بہ کثرت پڑھتے رہیے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١٠﴾ [الحشر: ١٠]

"اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ نہ رہنے دے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نہایت شفیق، نہایت مہربان ہے۔"

دوم: یہ بات جان لیجیے کہ امتِ اسلامیہ عقیدے کے اصول میں متفق ہے۔ سب اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ایک ہے، وہ ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے پاک ہے۔ سب مانتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ حلال وہی ہے جسے اللہ نے حلال کیا، حرام وہی ہے جسے اللہ نے حرام کیا اور دین وہی ہے جسے اللہ نے مشروع فرمایا۔

سوم: جن مسائل میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہوا ہے ان میں مجتہد دو حال سے خالی نہیں ہوتا:

یا وہ حق تک پہنچ گیا یا اس سے خطا ہو گئی۔ جو حق تک پہنچ گیا اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس سے خطا ہوئی اس کے لیے ایک اجر ہے۔ اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان ان امور کا فیصلہ فرمادے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے۔ جس اختلاف کی گنجایش پہلے لوگوں کے ہاں موجود تھی، اسے بعد والوں کے درمیان عداوت اور بغض کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ بعد والوں کے لیے بھی وہی وسعت کافی ہے جو ان کے اسلاف کے لیے تھی۔

چہارم: وہ ربانی علما جنھیں اللہ نے قبولِ عام عطا فرمایا، تکفیر، تضلیل اور تبدیع میں جرأت نہیں کرتے تھے

بل کہ مخالف کے لیے عذر تلاش کرتے تھے۔ امام بیہقی نے امام ابوالحسن اشعری سے نقل کیا ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے زاہر بن احمد سرخسی کو بلایا اور فرمایا:

”مجھ پر گواہ رہنا کہ میں اہلِ قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتا کیوں کہ سب ایک ہی معبود کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سب دراصل تعبیرات کا اختلاف ہے۔“

امام شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیر اعلام النبلاء میں فرمایا:

”میرا نظریہ بھی یہی ہے جو ہمارے شیخ ابن تیمیہ کا تھا؛ وہ بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے کہ میں امت میں کسی کی تکفیر نہیں کرتا۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وضو کی پابندی مؤمن ہی کرتا ہے۔ پس جو شخص وضو کے ساتھ نمازوں کی پابندی کرتا ہے وہ مسلمان ہے۔“

پنجم: مسلمانوں کے دشمن اس حقیقت کو خوب سمجھ چکے ہیں کہ امت فقہی اختلافات سے بہت حد تک آگے نکل آئی ہے۔ فقہی مذاہب کا تعصب اب پہلے زمانوں جیسا باقی نہیں رہا۔ اس لیے انھوں نے چاہا کہ امت کو عقائدی اختلافات میں الجھا دیا جائے۔ اس آگ کو بعض بکاؤ لوگ اور غفلت زدہ افراد بھڑکاتے رہتے ہیں تاکہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے رہیں اور دشمن اطمینان و عافیت سے رہیں۔

ششم: جو نجات چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو ان کاموں میں مشغول رکھے جو ایمان کو بڑھاتے اور یقین کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہ چیز اللہ عزوجل کی کائناتی نشانیوں اور مخلوقات میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی کتنی ہی روشن نشانیاں ہیں جن کی طرف اس نے خود متوجہ فرمایا اور جن میں تدبر کی دعوت دی ہے۔ قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھنا، اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا، فرائض کے بعد نوافل کی پابندی کرنا... یہ سب ایمان میں اضافے اور لغزش سے حفاظت کے اسباب ہیں۔

ہفتم: اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کے تقویٰ اور ہدایت میں اضافہ فرمائے۔ اوقاتِ قبولیت میں اللہ کے حضور آہ و زاری کیجیے۔ آپ کی زبان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ دعاؤں سے تر رہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَزِيمَةَ عَلَى الرُّشْدِ، وَالْغَنِيمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ.

”اے اللہ! میں تجھ سے رشد پر پختہ عزم، ہر نیکی کا حصہ اور ہر گناہ سے سلامتی مانگتا ہوں۔“

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَسْأَلَةِ، وَخَيْرَ الدُّعَاءِ، وَخَيْرَ الْعَمَلِ، وَخَيْرَ النَّجَاحِ، وَخَيْرَ الثَّوَابِ، وَخَيْرَ الْحَيَاةِ، وَخَيْرَ الْمَمَاتِ، وَثَبِّتْنِي وَثَقِّلْ مَوَازِينِي وَحَقِّقْ إِيمَانِي.

"اے اللہ! میں تجھ سے بہترین سوال، بہترین دعا، بہترین عمل، بہترین کام یابی، بہترین ثواب، بہترین زندگی اور بہترین موت مانگتا ہوں۔ مجھے ثابت قدم رکھ، میرے ترازو کو بھاری فرما اور میرے ایمان کو سچا کردے۔"

اسی طرح یہ دعائیں:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا صَادِقًا، وَيَقِينًا لَيْسَ بَعْدَهُ كُفْرٌ، وَرَحْمَةً أَنَالُ بِهَا شَرَفَ كَرَامَتِكَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

"اے اللہ! میں تجھ سے سچا ایمان اور ایسا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد کفر نہ ہو اور ایسی رحمت مانگتا ہوں جس کے ذریعے میں دنیا و آخرت میں تیری کرامت کے شرف کو پاسکوں۔"

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِي؛ حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يُصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي، وَرَضِّنِي مِنَ الْمَعِيشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِي.

"اے اللہ! میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں اتر جائے یہاں تک کہ میں جان لوں کہ مجھے وہی پہنچے گا جو تو نے میرے لیے لکھ دیا ہے اور جو رزق تو نے میرے لیے تقسیم فرمایا ہے اس پر مجھے راضی فرمادے۔"

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا مُطْمَئِنَّةً، تَرْضَى بِقَضَائِكَ، وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ، وَتُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ.

"اے اللہ! میں تجھ سے ایسی مطمئن جان مانگتا ہوں جو تیرے فیصلے پر راضی ہو، تیری عطا پر قناعت کرے اور تیری ملاقات پر ایمان رکھے۔"

اور اس طرح کی دوسری دعاؤں کا اہتمام کیجیے۔

آخر میں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ سوشل میڈیا ایسے دقیق مسائل کی بحث کا میدان نہیں جن میں بڑے بڑے اربابِ عقل حیران رہے ہیں۔ ان مباحث کی اصل جگہ محدود علمی نشستیں اور اختصاصی حلقاتِ علم ہیں جہاں دلائل تفصیل سے کھولے جاتے ہیں، حجتیں پیش کی جاتیں اور شبہات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو برکت دے، یہ بھی جان لیجیے کہ کوششوں کا رخ ان متفق علیہ مقاصد کی طرف ہونا چاہیے جن میں کفر، الحاد، فسق اور نافرمانی کا مقابلہ، منافقین کی حقیقت کو بے نقاب کرنا، منکرینِ سنت اور سیکولرزم، گلوبلائزیشن اور اس زمانے کے دوسرے فتنوں کو فروغ دینے والوں کے فریب کا پردہ چاک کرنا شامل ہے۔

اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور اسی سے مدد مانگی جاتی ہے۔

کبار اشعری محدثین کی خدمات اور غالیانہ فتووں کا جائزہ

شیخ علوی بن عبد القادر السقاف

ترجمانی: طاہر اسلام عسکری

مسلم مکاتبِ فکر کے مابین اختلاف کوئی آج کا حادثہ نہیں؛ یہ صدیوں سے ہماری علمی تاریخ کا حصہ چلا آرہا ہے۔ لیکن اہل سنت کی علمی روایت نے اختلاف کو کبھی عدل و انصاف سے بے نیاز نہیں ہونے دیا اور اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا کہ جہاں خطا ہو، وہاں نقد کیا جائے؛ جہاں حق ہو، وہاں اس کا اعتراف کیا جائے؛ اور کسی عالم کی ایک لغزش کو اس کی پوری علمی زندگی، دینی خدمات اور حسنات پر حاوی نہ کر دیا جائے۔ اشاعرہ اور سلفی مکتبِ فکر کے مابین اعتقادی اختلاف بھی معروف ہے لیکن افسوس کہ بعض جوشیلے حلقوں نے اس اختلاف کو اس حد تک پہنچا دیا کہ امام نووی اور حافظ ابن حجر جیسے ائمۂ حدیث بھی تبدیع و تضلیل کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ رویہ اہلِ سنت کے منہجِ اعتدال اور منصفانہ روش سے یک سر بیگانہ ہے۔ سعودی عرب کے معروف سلفی عالم شیخ علوی بن عبد القادر السقاف نے زیرِ نظر مضمون اسی غلو کے رد میں لکھا ہے جو عربی میں عُلَماءُ الأشاعِرةِ الشَّرْعيُّون بَينَ جِنايةِ الغُلاةِ وواجِبِ الإنصافِ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ شیخ موصوف اشاعرہ وماتریدیہ کے افکار پر خود ایک مفصل تنقیدی تصنیف کے مصنف ہیں، اس لیے ان کی یہ تحریر کسی اعتقادی مداہنت کا نتیجہ نہیں بل کہ اس اصول کی ترجمان ہے کہ اختلاف میں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی اہلِ سنت والجماعت کے جمہور ائمہ کی مجموعی روش رہی ہے۔ ہمارے برصغیر میں بھی بعض اوقات مسلکی اختلاف کے زیرِ اثر اکابر اہلِ علم کے بارے میں ایسی ہی سخت اور بے محابا زبان سنائی دیتی ہے۔ ادارۂ محدث نے اسی احساس کے پیشِ نظر اس وقیع مضمون کا اردو ترجمہ پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مصنف مؤسسۃ الدرر السنیۃ کے نگرانِ اعلیٰ ہیں جس کے زیرِ اہتمام حدیث، عقیدہ، فقہ، فرق، اخلاق و سلوک اور دوسرے اسلامی علوم میں متعدد عظیم علمی موسوعات اور تحقیقی منصوبے جاری ہیں۔ امید ہے کہ یہ تحریر اختلاف کے ہنگام بھی حق گوئی کے ساتھ انصاف اور نقد کے ساتھ قدر شناسی کی اس روایت کو تازہ کرنے میں مدد دے گی جو ہمارے اسلاف کا امتیاز رہی ۔ (ادارہ)

---

۱ نگرانِ اعلیٰ، الدرر السنیۃ

۲ فاضل، جامعہ لاہور الاسلامیہ رحمانیہ

انصاف عدل ہی کی ایک شاخ ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے۔ یہ ایک عظیم اخلاقی قدر اور جانچ پرکھ کا نہایت باریک پیمانہ ہے جس سے علما کے مراتب پہچانے جاتے ہیں، امت کی وحدت قائم رہتی ہے اور پیش رو اہل علم کی کاوشیں تحقیر اور انکار سے محفوظ رہتی ہیں۔

عدل و انصاف کا حق اسی وقت ادا ہوتا ہے کہ ہم شخصیات کو خواہش نفس کے ترازو پر نہیں، شریعت کی میزان پر پرکھیں۔ ان کی جو بات حق کے مطابق ہو، اس کی تحسین کریں اور جہاں انھوں نے خطا کی ہو، اسے واضح کریں؛ ساتھ ہی ان کے علمی مقام و مرتبے کا بھی لحاظ رکھیں۔ کسی باطل بات کی موجودگی سے حق اپنی وقعت نہیں کھو دیتا اور نہ ہی کسی کا باطل قول اس بنا پر قبول کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس حق بھی موجود ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں علمی فضا ایک خطرناک آفت کی لپیٹ میں آ گئی ہے؛ اور وہ ہے لوگوں کو بدعتی، گم راہ اور کافر قرار دینے میں حد سے گزر جانا۔ اس خرابی کا ایک نمایاں مظہر اشاعرہ اور علمائے اشاعرہ کے بارے میں اختیار کیا جانے والا رویہ ہے۔ ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اشاعرہ کی بلا استثنا تکفیر کر ڈالی بل کہ یہاں تک جسارت کی کہ انھیں مشخص طور سے کافر ٹھیرایا اور ان علما کو گم راہ قرار دیا جن کی خدمتِ اسلام میں بیش بہا علمی کاوشیں مسلم ہیں، جیسے امام نووی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہا اللہ اور دیگر جلیل القدر ائمۂ امت جن کی مختلف علوم سے متعلق تصنیفات دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اگر ان دونوں اماموں، نووی اور ابن حجر، کا یہی ایک کارنامہ ہوتا کہ انھوں نے کتابِ اللہ کے بعد دو صحیح ترین کتابوں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، کی بہترین شرحیں لکھیں تو ان کی جلالتِ شان، بلند علمی مرتبے اور امت میں ان کے اثر و نفوذ کو واضح کرنے کے لیے یہی ایک بات کافی تھی۔ پھر ان کی عظمت کا اندازہ کیجیے کہ علم کی فراوانی، حسنِ تصنیف، وسعتِ فہم اور وہ دائمی نفع بھی ان کے حصے میں آیا جس سے امت آج تک فیض یاب ہو رہی ہے۔

یہ دونوں ائمہ سنت و آثار کی تعظیم، ان کے دفاع، سلف سے محبت اور بدعت اور اہلِ بدعت کی مذمت کے لیے معروف تھے۔ البتہ ان کی علمی نشو و نما ایک اشعری ماحول میں ہوئی، چناں چہ ان سے بعض اعتقادی لغزشیں سرزد ہوئیں۔ لیکن وہ فلسفے اور علمِ کلام کی گہرائیوں میں نہیں اترے تھے، اس لیے لازم ہے کہ انھیں معذور سمجھا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مقامات پر انھوں نے اشاعرہ سے اختلاف کیا؛ تاہم اس باب میں دونوں کا موقف ایک درجے کا نہ تھا؛ حافظ ابن حجر نے اشعری آرا سے امام نووی کی بہ نسبت زیادہ اختلاف کیا ہے۔

بہ ہر حال، علما کے اقوال سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں ان جلیل القدر علمائے اسلام میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے سنتِ نبوی کی گراں قدر خدمت کی اور اس کا دفاع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصانیف کو مسلمانوں کے تمام طبقوں میں قبولِ عام اور وسیع اشاعت عطا فرمائی۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عقیدے کے ابواب میں ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ان سے خبردار کیا جائے لیکن اسی کے ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور دیگر علوم میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کی عظیم خدمات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ میں پیدا ہونے والا یہ غلو فہم کی خرابی اور منہج کے اضطراب ہی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بنیادی اسباب کو چار بڑی لغزشوں میں سمیٹا جا سکتا ہے اور اس مضمون میں انھی کو زیرِ بحث لایا جائے گا:

① تکفیر مطلق اور تکفیر معین میں فرق نہ کرنا۔

② اشاعرہ اور جہمیہ کو ایک ہی درجے میں رکھنا۔

③ تاویل اور انکار کے فرق و امتیاز کو نظر انداز کرنا اور ہر تاویل کرنے والے کو منکر، معطل اور جاحد کے درجے میں رکھ دینا۔

④ اپنی رائے پر بے جا اعتماد اور اکابر علمائے اہلِ سنت کے علمی مقام اور قدر و منزلت کا لحاظ کیے بغیر ان کی مخالفت کی جسارت۔

یہیں سے اس باب میں انصاف کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے اور اس نہایت باریک توازن کی ضرورت سامنے آتی ہے جس میں ایک طرف صحیح عقیدے کا دفاع ہو اور دوسری علمائے امت کے علمی مقام اور ان کی خدمات کا تحفظ بھی۔

ان بنیادی فکری و منہجی غلطیوں کی تفصیل شروع کرنے سے پہلے اشاعرہ اور مذہبِ اشعری سے متعلق چند حقائق پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

① مذہبِ اشعری اسلامی مذاہب میں شامل ہے جس نے عقیدے کے متعدد مسائل میں سلفی منہج، یعنی اہل سنت والجماعت کے طریقے، سے اختلاف کیا ہے[1]۔

② متقدمین اشاعرہ ان متاخرین سے بہتر تھے جو یونانی فلسفے اور متکلمین کی گم راہ کن موشگافیوں سے متاثر ہوئے۔

---

1 دیکھیے مقالہ بہ عنوان: نَقضُ دعوى انتِسابِ الأشاعِرةِ لأهلِ السُّنَّةِ والجماعةِ.

③ ملحدین، معتزلہ اور جہمیہ کے بالمقابل اسلام کے دفاع میں اشاعرہ اور ان کے علمانے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اسی بنا پر بہت سے علمائے اسلام نے ان کی تحسین کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

④ مذہبِ اشعری کے ابتدائی دور میں، جب وہ اہلِ حدیث و سنت کے منہج سے بہت کچھ مختلف تھا، دونوں گروہوں کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تھی جو بعض اوقات کچھ افراد کی طرف سے باہمی تکفیر تک جا پہنچی۔ لیکن چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بعد اہلِ سنت میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا عالم ملتا ہے جو اشاعرہ اور ان کے علما کی تکفیر کرتا ہو۔ یہاں تک کہ عصرِ حاضر میں ایک مختصر گروہ ایسا سامنے آیا جس نے کسی منصفانہ تفریق اور اشاعرہ و جہمیہ کے بنیادی اختلافات کا لحاظ کیے بغیر اشاعرہ کو خالص جہمیہ کے برابر قرار دے دیا۔

غالیوں کی بنیادی غلطیاں اور ان کا محاسبہ

میں نے اس فکری بگاڑ پر غور کیا جسے معاصر غالیوں نے اپنے منہج کی بنیاد بنایا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ چار ایسی پے در پے غلطیوں پر قائم ہے جن میں سے ہر اگلی غلطی پہلی پر استوار ہے۔

ان میں پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ سلف کے ایسے اقوال سے استدلال کرتے ہیں جن میں کہا گیا ہے: "جس نے فلاں بات کہی، وہ کافر ہے"، یا "جس نے قرآن کو مخلوق قرار دیا یا اللہ تعالیٰ کے علو کا انکار کیا، وہ جہمی ہے۔"

پھر وہ دوسرے مرحلے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس میں وہ سلف سے منقول ان اقوال کو دلیل بناتے ہیں جن میں جہمیہ کی تکفیر کی گئی ہے اور ان کے ساتھ بعض اہلِ علم کی وہ عبارات بھی پیش کرتے ہیں جن میں اشاعرہ کو جہمیہ کہا گیا ہے، یا یہ کہ علوِ الٰہی کے اثبات کے بارے میں ان کا موقف جہمیہ کے موقف سے بھی زیادہ خبیث ہے۔ اس طرح وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اشاعرہ جہمیہ ہیں، جہمیہ کافر ہیں، لہٰذا اشاعرہ بھی کافر ہیں!

اسی طرح وہ ان بعض علما کی آرا سے استدلال کرتے ہیں جنھوں نے اشاعرہ کو کافر قرار دیا ہے لیکن ان سے کئی گنا زیادہ ان علما کو نظر انداز کر دیتے ہیں جنھوں نے اشاعرہ کی تکفیر نہیں کی بل کہ ان کے لیے رحمت کی دعا کی اور ان کے علوم و خدمات کو سراہا، جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔

جب ان کے نزدیک اشاعرہ کی تکفیر طے ہو گئی تو یہی بات انھیں آخری مرحلے تک لے گئی، یعنی اشاعرہ کے علما کی تکفیر، خواہ دین میں ان کا مقام کتنا ہی بلند ہو۔ چناں چہ امام نووی اور حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر ائمہ کو بھی کافر قرار دیا گیا، کجا ان سے کم درجے کے علما، مثلاً ابن الصلاح، عز بن عبد السلام اور ابن دقیق العید۔

یوں انھوں نے اصولِ عقائد کے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کو بڑی آسانی سے ابتدائی درجے کی ایک ریاضیاتی

مساوات میں سمیٹ دیا:

ب+۲=۳، لہٰذا ب=۱۔

لیکن عقیدے کے مسائل ایسی سادہ لوحی سے حل نہیں ہوتے! لا هَکَذا یا سَعدُ تورَدُ الاِبِلُ!

(اور نہ، اے سعد، اونٹ یوں گھاٹ پر لائے جاتے ہیں!)

اب وہ مقام آگیا ہے کہ ان چار بنیادی غلطیوں کی تفصیل بیان کی جائے جن پر انھوں نے اپنے منہج کی بنیاد رکھی ہے۔

پہلی بنیادی غلطی: تکفیر مطلق اور تکفیر معین میں عدم تفریق

اہل سنت والجماعت کے نزدیک اقوال، افعال اور اعتقادات پر مجمل طور سے تکفیر مطلق کا حکم لگایا جاتا ہے؛ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جو شخص دین کی کسی ایسی بات کو حلال ٹھیرا لے جس کی حرمت ضروریاتِ دین میں سے ہے، وہ کافر ہے؛ جو قرآن کو مخلوق کہے، وہ کافر ہے؛ اور جو اللہ تعالیٰ کے علو کا انکار کرے، وہ کافر ہے۔

لیکن یہی حکم کسی متعین شخص پر اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب تمام شرائط پوری ہو جائیں اور حکم کے راستے میں حائل تمام موانع دور ہو جائیں کیوں کہ ہر وہ شخص جو کسی کافرانہ قول یا فعل میں مبتلا ہو جائے، لازماً کافر قرار نہیں پاتا، تا آں کہ اس پر حجت قائم ہو جائے اور اس کا شبہہ دور کر دیا جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ایک قول اپنی نوعیت کے اعتبار سے کفر ہو سکتا ہے، چناں چہ مطلق طور پر اس کے قائل کی تکفیر کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس نے ایسی بات کہی، وہ کافر ہے۔ لیکن کسی متعین شخص نے اگر وہ بات کہی ہو تو اس وقت تک اس کے کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، جب تک اس پر وہ حجت قائم نہ ہو جائے جسے قبول نہ کرنے والا کافر قرار پاتا ہے[1]۔"

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

"کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کافر قرار دے، خواہ اس سے کوئی خطا یا غلطی سرزد ہوئی ہو، جب تک اس پر حجت قائم نہ کر دی جائے اور اس کے سامنے راہِ حق واضح نہ کر دی جائے۔ جس شخص کا اسلام یقین کے ساتھ ثابت ہو، محض شک کی بنا پر اس سے اسلام کا حکم زائل نہیں ہو سکتا

---

1 مجموع الفتاوی، ۲۳ / ۳۴۵.

بل کہ یہ حکم اسی وقت زائل ہوگا جب اس پر حجت قائم ہو جائے اور اس کا شبہہ زائل کر دیا جائے[1]۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"میں انھیں یہ بات سمجھاتا تھا کہ سلف اور ائمہ سے جو یہ مطلق اقوال منقول ہیں کہ فلاں اور فلاں بات کہنے والا کافر ہے، وہ بھی برحق ہیں؛ لیکن مطلق حکم اور کسی متعین شخص پر اس کے انطباق کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ اصولِ دین کے بڑے مسائل میں یہ پہلا مسئلہ تھا جس میں امت کے اندر اختلاف پیدا ہوا اور وہ مسئلۂ وعید ہے[2]۔"

مزید لکھتے ہیں:

"بعض اقوال ایسے ہوتے ہیں جن کا قائل کافر ہو جاتا ہے لیکن ممکن ہے کسی شخص تک وہ نصوص پہنچی ہی نہ ہوں جن سے حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نصوص اس کے علم میں ہوں مگر اس کے نزدیک ثابت نہ ہوئی ہوں، یا وہ انھیں سمجھ نہ سکا ہو۔ کبھی اسے ایسے شبہات بھی لاحق ہو جاتے ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معذور قرار پاتا ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان میں سے جو شخص حق کی جستجو میں اجتہاد کرے اور اس سے خطا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی خطا معاف فرما دیتا ہے، خواہ اس کا تعلق علمی و نظری مسائل سے ہو یا عملی مسائل سے۔ یہی طریقہ اصحابِ رسول ﷺ اور جمہور ائمۂ اسلام کا رہا ہے[3]۔"

موجودہ دور کے ان جیسے غالیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جب بھی انھیں یہ قول ملتا ہے کہ 'جس نے فلاں بات کہی، وہ کافر ہے' تو سننے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ حکم ہر اس شخص کو شامل ہے جو ایسی بات کہے۔ وہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ تکفیر کے لیے کچھ شرائط اور موانع ہوتے ہیں اور ممکن ہے کسی متعین شخص کے حق میں وہ شرائط پوری نہ ہوں یا موانع موجود ہوں۔ تکفیرِ مطلق سے تکفیرِ معین لازم نہیں آتی، الّا یہ کہ تمام شرائط پائی جائیں اور تمام موانع دور ہو جائیں[4]۔"

۱　مجموع الفتاوی، ۱۲ / ٤٦٦.

۲　مجموع الفتاوی، ۳ / ۲۳۰.

۳　مجموع الفتاوی، ۲۳ / ۳٤٦-۳٤۹.

٤　مجموع الفتاوی، ۱۲ / ٤۸۷.

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کسی معین شخص کی تکفیر ایک معروف مسئلہ ہے۔ کوئی شخص ایسا قول کہے جو کفر ہو تو عمومی طور پر کہا جائے گا کہ جس نے یہ قول اختیار کیا، وہ کافر ہے۔ لیکن جب کوئی متعین شخص وہی بات کہے تو اس وقت تک اس کے کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا جب تک اس پر وہ حجت قائم نہ ہو جائے جسے رد کرنے والا کافر قرار پاتا ہے[1]۔"

اس سے لوگوں میں پائے جانے والے دو گروہوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے:

ایک گروہ نے تکفیر میں غلو کیا اور شرائط و موانع کا لحاظ کیے بغیر مطلق طور پر لوگوں کو کافر قرار دے دیا۔

دوسرے گروہ نے کسی معین شخص کی تکفیر سے مطلقاً گریز کیا اور یوں ارتداد کے حکم کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ سنت کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان معتدل موقف اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

دوسری بنیادی غلطی: اشاعرہ کا جہمیہ سے الحاق

بعض ناواقف لوگ، یا وہ جن پر معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ سلف نے جہمیہ کی تکفیر محض اس بنا پر کی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علو کو ثابت نہیں کرتے تھے۔ چناں چہ وہ ہر اس شخص کو کافر قرار دے دیتے ہیں جو اللہ سبحانہٗ کے علو کا اثبات نہ کرے اور اسے جہمیہ میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ جہمیہ کی تکفیر اس لیے کی گئی کہ وہ صفاتِ الٰہی کا اثبات نہیں کرتے تھے جب کہ بعض دوسرے لوگ اس تکفیر کو صرف قرآن کے مخلوق ہونے کے قول تک محدود سمجھتے ہیں۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی خالص جہمیہ جن کی سلف نے تکفیر کی، ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وجود میں کوئی ایسا خالق باقی نہیں رہتا جو برحق معبود ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات کا انکار کرتے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ثابت نہ مانتے تھے۔ ان کے نزدیک نہ وہ خالق ہے نہ خلاّق، نہ راحم ہے نہ رحیم، نہ عالم ہے نہ علیم۔ وہ قرآن کو مخلوق کہتے، روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کرتے اور خالص جبریہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کا اپنا کوئی ارادہ نہیں، وہ ہوا کے رخ پر اڑتے ہوئے پر کے مانند ہے۔

اس کے بعد یہ لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اشاعرہ جہمیہ ہیں کیوں کہ وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے! یہ درست ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے علو اور اس کے آسمان پر ہونے کا انکار کرے، اس

---

1 الدرر السنية، ١٠ / ٤٣٢.

میں جہمیہ کی ایک خصلت پائی جاتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر اسی مفہوم کو یوں بیان کیا ہے: ''اس میں جہمیہ اور معتزلہ کا ایک شائبہ پایا جاتا ہے[1]۔''

کبھی وہ فرماتے ہیں: ''اس میں تجہم کی ایک نوع پائی جاتی ہے[2]۔''

لیکن اشاعرہ اللہ عزوجل کے اسماء کا اثبات کرتے ہیں اور اس موضوع پر ان کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں۔ وہ بعض صفات کو ثابت مانتے ہیں اور بیش تر کی تاویل کرتے ہیں؛ ان کا انکار نہیں کرتے جیسا کہ جہمیہ کرتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے صفاتِ الٰہی کے باب میں لوگوں کے مختلف اقوال بیان کرتے ہوئے انھیں تین درجوں میں تقسیم کیا ہے: پہلے درجے میں باطنی قرامطہ، دوسرے درجے میں خالص جہمیہ اور تیسرے درجے میں اشاعرہ۔ پھر اشاعرہ کے بارے میں فرمایا: ''صفات کے باب میں وہ خالص جہمیہ نہیں ہیں، البتہ ان میں تجہم کی ایک نوع پائی جاتی ہے[3]۔''

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ''ان کے اقوال میں جہمیہ کے بعض اصول پائے جاتے ہیں[4]۔''

اس کے باوجود سلف ہر اس شخص کو کافر قرار نہیں دیتے تھے جو جہم کا کوئی قول اختیار کر لیتا، نہ جہمیہ کے ہر معین فرد کی تکفیر کرتے تھے۔ پھر اس شخص کو کیسے کافر کہا جا سکتا ہے جو اشاعرہ کا قول اختیار کرے، کجا وہ شخص جو ان کی بعض آرا سے اتفاق اور بعض سے اختلاف رکھتا ہو جیسے امام نووی اور حافظ ابن حجر رحمہا اللہ!

جہمیہ کے معین افراد کے بارے میں امام احمد کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امام احمد نے جہمیہ کے معین افراد کی تکفیر نہیں کی، نہ ہر اس شخص کو کافر قرار دیا جو اپنے آپ کو جہمی کہتا تھا اور نہ ہر اس شخص کی تکفیر کی جو جہمیہ کی بعض بدعات میں ان سے متفق تھا بلکہ انھوں نے ان جہمی حکم رانوں کے پیچھے نماز بھی پڑھی جنھوں نے اپنے عقیدے کی دعوت دی، لوگوں کو اس کی آزمائش میں ڈالا اور ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں جو ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ امام احمد اور ان

١　الفتاوى الكبرى، ٢ / ٤٠٣.

٢　مجموع الفتاوى، ٦ / ٥٥.

٣　مجموع الفتاوى، ٦ / ٥٥.

٤　مجموع الفتاوى، ١٢ / ٢٠٦.

جیسے دوسرے ائمہ نے ان کی تکفیر نہیں کی بل کہ انھیں مسلمان اور برحق حاکم سمجھا اور ان کے لیے دعا کی۔ وہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے، ان کے ساتھ حج اور جہاد کرنے اور ان کے خلاف خروج سے باز رہنے کے قائل تھے جیسا کہ دوسرے حکم رانوں کے بارے میں بھی ان کا یہی موقف تھا۔ اس کے ساتھ وہ ان کے ایجاد کردہ اس باطل قول کا انکار بھی کرتے تھے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے بہت بڑا کفر تھا، اگرچہ انھیں خود اس کے کفر ہونے کا علم نہ تھا۔ امام احمد اس قول کی تردید کرتے اور اپنی استطاعت کے مطابق اسے رد کرنے کے لیے ان کے مقابلے میں جدوجہد کرتے رہے۔ یوں انھوں نے سنت و دین کو نمایاں کرنے اور ملحد جہمیہ کی بدعات کا انکار کرنے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو بھی قائم رکھا اور ائمۂ امت اور عام اہلِ ایمان کے حقوق کی رعایت بھی ملحوظ رکھی، اگرچہ وہ جاہل و بدعتی اور ظالم و فاسق ہی کیوں نہ ہوں[1]۔"

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بعض غالیوں کا یہ دعویٰ سراسر فریب اور حقیقت کو چھپانے کی کوشش ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے ان حکم رانوں کے خلاف خروج اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ اس کی قدرت نہ رکھتے تھے، نہ اس لیے کہ وہ انھیں کافر نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل یہ امت کو مغالطے میں ڈالنے اور اپنے باطل منہج کے لیے جواز پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اس بات کی ایک اور دلیل کہ امام احمد رحمہ اللہ ہر جہمی کو کافر نہیں سمجھتے تھے، یہ ہے کہ وہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے کو جائز قرار دیتے تھے۔ ان کا قول ہے:

"میں جہمیہ اور رافضہ کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتا، البتہ جو چاہے شریک ہو[2]۔"

وہ خود ان کی نمازِ جنازہ سے اس لیے گریزاں تھے کہ نبی ﷺ نے اس شخص کی نمازِ جنازہ سے گریز فرمایا تھا جو قرض چھوڑ کر مرا ہو؛ اگر امام احمد ہر جہمی کو کافر سمجھتے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"امام احمد اور ان جیسے دیگر ائمہ نے جن سے تکفیر کے یہ عمومی اقوال منقول ہیں، ان لوگوں کی اکثریت کو معین طور پر کافر قرار نہیں دیا جنھوں نے بعینہٖ یہ باتیں کہی تھیں... پھر امام احمد نے خلیفہ

---

١ مجموع الفتاوى، ٧ / ٥٠٧.

٢ دیکھیے: المغني، ابن قدامة، ٢ / ٤١٦.

اور ان دوسرے لوگوں کے لیے دعا کی جنھوں نے انھیں مارا اور قید کیا تھا، ان کے لیے مغفرت طلب کی اور اپنے اوپر ڈھائے گئے مظالم اور اس قول کی دعوت دینے کے معاملے میں انھیں معاف کر دیا جو بجائے خود کفر تھا۔ اگر وہ اسلام سے مرتد ہو چکے ہوتے تو ان کے لیے استغفار جائز نہ ہوتا کیوں کہ کتاب وسنت اور اجماع کی رُو سے کفار کے لیے استغفار جائز نہیں۔ امام احمد اور دوسرے ائمہ کے یہ اقوال واعمال اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ انھوں نے جہمیہ کے ان معین افراد کو کافر قرار نہیں دیا تھا جو قرآن کو مخلوق کہتے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کرتے تھے[1]۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"امام احمد رحمہ اللہ نے ان کے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا اس لیے کی کہ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں پر یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ وہ رسولؐ کی تکذیب کر رہے ہیں یا آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کا انکار کر رہے ہیں بل کہ انھوں نے تاویل کی، اس میں خطا کی اور ان لوگوں کی تقلید کی جنھوں نے انھیں یہ بات سمجھائی تھی[2]۔"

اگر امام احمد ان میں سے ہر شخص کو معین طور پر کافر سمجھتے تو ان کے لیے رحمت کی دعا نہ کرتے۔

جب علمِ کلام میں مشغول شخص تاویل کرتے ہوئے خطا کا مرتکب ہو تو اسے کافر قرار نہیں دیا جاتا، پھر اس شخص کو کیسے کافر کہا جا سکتا ہے جس نے فلسفے کی موشگافیوں میں پڑے اور علمِ کلام سے شغف رکھے بغیر محض اس کی تقلید کی ہو؟ امام نووی اور حافظ ابن حجر دراصل شریعت کے اکابر علما میں سے تھے؛ وہ علمِ کلام کے ماہرین اور متخصصین میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تحریروں میں بعض تاویلات محض اس لیے دَر آئیں کہ وہ اپنے عہد کے متکلمین میں رائج افکار سے متاثر تھے، ورنہ علمِ کلام نہ ان کا اصل میدان تھا اور نہ ان کے اختصاصات میں شامل؛ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت فرمائے۔

اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے زمانے کے ان جہمیوں کو بھی کافر قرار نہیں دیا جنھوں نے ان سے مناظرے کیے تھے، اگرچہ انھوں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کا قول کفر ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

1 مجموع الفتاوى، ١٢ / ٤٨٨.

2 المسائل الماردينية، ص ١٥٨.

"جب حلولیہ جہمیہ اور ان منکرین کی آزمائش کا مرحلہ پیش آیا جو اللہ تعالیٰ کے عرش کے اوپر ہونے کا انکار کرتے تھے تو میں ان سے کہا کرتا تھا: اگر میں تمھاری بات مان لوں تو کافر ہو جاؤں گا؛ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تمھارا قول کفر ہے لیکن میرے نزدیک تم کافر نہیں ہو کیوں کہ تم جاہل ہو۔ یہ بات میں ان کے علما، قاضیوں، شیوخ اور امرا سے کہتا تھا۔ ان کی جہالت کی اصل وہ عقلی شبہات تھے جو ان کے بڑوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے جب کہ صحیح منقول اور اس کے موافق صریح معقول سے ان کی واقفیت ناقص تھی[1]۔"

اس بات کی ایک اور دلیل کہ سلف جب یہ کہتے تھے کہ "جس نے فلاں بات کہی، وہ جہمی ہے" تو ان کی مراد خالص جہمیہ نہ ہوتی تھی، امام احمد کا یہ قول ہے کہ جو شخص حدیث: "اللہ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا" میں صورت کی ضمیر کو آدم کی طرف لوٹاتا ہے، اللہ عزوجل کی طرف نہیں، وہ جہمی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"خلال نے ابو طالب سے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے ابو عبداللہ، یعنی احمد بن حنبل کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص یہ کہے کہ اللہ نے آدم کو آدم ہی کی صورت پر پیدا کیا، وہ جہمی ہے[2]۔"

حالاں کہ امام ابو بکر محمد بن اسحاق ابن خزیمہ جو اپنے زمانے میں اہلِ سنت کے امام تھے، اس بات کو نہایت ناپسند کرتے تھے کہ اس حدیث میں صورت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

"عطا کی روایت میں وارد اس لفظ کے باعث بہت سے ایسے لوگ فتنے میں پڑ گئے جنھوں نے تحقیقِ علم سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ اس روایت میں صورت کی نسبت رحمٰن کی طرف کرنا صفاتِ ذات کی نسبت کے قبیل سے ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک کھلی غلطی کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے ایک ایسی قبیح بات کہی جو مشبہہ کے قول سے مشابہ تھی۔ اللہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ان

---

١ الرد على البكري، ٢ / ٤٩٤.

٢ بيان تلبيس الجهمية في تأسيس بدعهم الكلامية، ٦ / ٤١٦. نیز دیکھیے: إبطال التأويلات، القاضي أبو يعلى، ص ٨٨؛ الاعتقاد، ابن أبي يعلى، ص ٢٧؛ طبقات الحنابلة، ابن أبي يعلى، ١ / ٣٣٦.

کے قول سے محفوظ رکھے[1]۔"

اس کے باوجود علمائے امت میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس نے امام ابن خزیمہ کو جہمیہ میں شمار کیا ہو۔

عقائد اور فرق و مذاہب کے علم سے دل چسپی اور واقفیت رکھنے والا ہر منصف شخص جانتا ہے کہ اشاعرہ ان گروہوں میں نمایاں ہیں جنھوں نے جہمیہ اور معتزلہ کی سب سے زیادہ تردید کی اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں۔ یہ درست ہے کہ مذموم علم کلام میں مشغول ہونے کے باعث وہ ان کے بعض اقوال سے متاثر بھی ہوئے لیکن آخر انھیں ایسے لوگوں سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے جن پر وہ خود تنقید کرتے، جن کی مذمت کرتے اور جن سے خبردار کرتے رہے ہیں؟ بل کہ اشاعرہ جہمیہ کو گم راہ اور بدعتی قرار دیتے، انھیں اہل اہوا و بدعات میں شمار کرتے اور رافضہ، خوارج اور معتزلہ کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں۔

عبد القاہر بغدادی لکھتے ہیں:

"اہل اہوا میں رافضہ، قدریہ، خوارج، جہمیہ اور نجاریہ شامل ہیں[2]۔"

ابن فورک کہتے ہیں:

"بدعتی اور فاسد خواہشات کے پیروکار وہ لوگ ہیں جو کتاب و سنت کی راہوں سے منحرف ہیں، جیسے جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور رافضہ[3]۔"

ابن عساکر رقم طراز ہیں:

"...اہل اہوا ظاہر ہوئے اور خوارج، جہمیہ، معتزلہ اور قدریہ جیسے اہل بدعت کی کثرت ہو گئی[4]۔"

ابن العربی نے لکھا ہے:

"تمام اہل بدعت، جہمیہ، معتزلہ اور خوارج[5]۔"

---

١ كتاب التوحيد، ١ / ٨٦.

٢ أصول الإيمان، ص ١٠.

٣ مشكل الحديث وبيانه، ص ٣٨.

٤ تبيين كذب المفتري فيما نُسب إلى الأشعري، ص ٣٥٨.

٥ قانون التأويل، ص ٣٥٧.

پھر اشاعرہ کو ان خالص جہمیہ کے برابر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جن کی سلف نے مجمل طور پر تکفیر کی تھی؟

تیسری بنیادی غلطی: علمائے اشاعرہ کی معین تکفیر

ان لوگوں نے پہلے جہمیہ کی تکفیر کی، پھر اشاعرہ کو بھی انھی کے زمرے میں شامل کر دیا اور اس کے بعد اشاعرہ کے متعین افراد کی تکفیر تک جا پہنچے؛ کبھی صاف لفظوں میں انھیں کافر کہا اور کبھی اشارے کنایے میں؛ انھوں نے اشاعرہ کی تاویل اور خالص جہمیہ کے انکار و جحود میں کوئی فرق نہ کیا۔ یہ علم میں پختگی رکھنے والوں کا طریقہ نہیں؛ وہ تاویل کرنے والوں کو خطا پر تو قرار دیتے ہیں مگر انھیں معذور بھی سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ صفات کے منکروں، جاحدوں اور معطلین جیسا معاملہ نہیں کرتے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جو شخص تاویل کرتے ہوئے رسول ﷺ کی پیروی ہی کا ارادہ رکھتا ہو، وہ اجتہاد میں خطا کر جانے کے باعث نہ کافر قرار پاتا ہے، نہ فاسق۔ عملی مسائل میں یہ بات لوگوں کے ہاں معروف ہے لیکن عقائد کے مسائل میں بہت سے لوگوں نے خطا کرنے والوں کی تکفیر کی ہے۔ یہ موقف نہ کسی صحابی سے منقول ہے، نہ یہ طریق احسان ان کی پیروی کرنے والے تابعین سے اور نہ ائمۂ مسلمین میں سے کسی سے۔ دراصل یہ اہل بدعت کا طریقہ ہے کہ وہ ایک بدعت ایجاد کرتے ہیں اور اپنے مخالف کو کافر قرار دیتے ہیں، جیسے خوارج، معتزلہ اور جہمیہ[1]۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"میں ان لوگوں میں سب سے بڑھ کر اس بات سے روکتا ہوں کہ کسی معین شخص کو کافر، فاسق یا گناہ گار قرار دیا جائے، الّا یہ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس پر حجتِ رسالت قائم ہو چکی ہے جس کی مخالفت کرنے والا کبھی کافر، کبھی فاسق اور کبھی گناہ گار قرار پاتا ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطا معاف فرما دی ہے اور یہ حکم اعتقادی و قولی مسائل کی خطا کو بھی شامل ہے اور عملی مسائل کی خطا کو بھی۔ سلف ان میں سے بہت سے مسائل میں ہمیشہ اختلاف کرتے رہے مگر ان میں سے کسی نے اپنے کسی مخالف کو نہ کافر قرار دیا، نہ فاسق اور نہ گناہ گار[2]۔"

اشاعرہ اور دوسرے گروہوں کو کفر سے بری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

1. منهاج السنة النبوية، ٥ / ٢٣٩–٢٤١.
2. مجموع الفتاوى، ٣ / ٢٢٩.

"اگر ان لوگوں[1] کی تکفیر کی جائے تو لازم آئے گا کہ شافعیہ، مالکیہ، حنفیہ، حنابلہ، اشاعرہ، اہل حدیث، مفسرین اور صوفیہ کی ایک بڑی تعداد کو بھی کافر قرار دیا جائے حالاں کہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ لوگ کافر نہیں ہیں[2]۔"

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی بعض صفات سے ناواقف ہو یا ان کی تاویل کرے لیکن اہل اجتہاد میں سے ہو، رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا حریص ہو اور اس کا رویہ انکار، عناد اور تکبر پر مبنی نہ ہو تو اسے معذور سمجھا جائے گا۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جس نے کہا تھا:

"جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر میری راکھ پیس کر سمندر میں بکھیر دینا۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ مجھے دوبارہ اٹھانے پر قادر ہوا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا ہو گا[3]۔"

اس حدیث پر تعلیق لگاتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور راکھ بکھیر دیے جانے کے بعد اپنے دوبارہ اٹھائے جانے میں شک کیا بلکہ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ اسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ بات بہ اتفاق اہل اسلام کفر ہے لیکن وہ حقیقتِ حال سے ناواقف تھا اور اسے اس بات کا علم نہ تھا۔ وہ صاحبِ ایمان تھا اور اللہ کے عذاب سے ڈرتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اسی خوف کی بنا پر اسے بخش دیا۔ پھر جو صاحبِ اجتہاد تاویل کی بنا پر خطا کرے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا حریص بھی ہو، وہ ایسے شخص کی بہ نسبت مغفرت کا کہیں زیادہ حق دار ہے[4]۔"

اور نووی وابن حجر سے زیادہ اس وصف کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟

ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں:

"کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ علما کی لغزشوں کے پیچھے پڑے، جس طرح اسے یہ حق بھی نہیں کہ اہل علم وایمان کے بارے میں ایسی بات کہے جس کے وہ سزاوار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی

1 یعنی علما، جب ان سے خطا ہو جائے۔
2 مجموع الفتاوی، ٣٥ / ١٠١.
3 أخرجه البخاري، ٣٤٨١؛ ومسلم، ٢٧٥٦.
4 مجموع الفتاوی، ٣ / ٢٣١.

خطاؤں سے درگزر فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: 'اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'میں نے ایسا ہی کیا'۔[1] "

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اگر کسی امام سے کسی جزوی مسئلے میں اجتہادی خطا سرزد ہو جو اس کے لیے قابلِ معافی ہو اور ہم ہر بار اس کے درپے ہو جائیں، اسے بدعتی قرار دیں اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں تو ہمارے اس معیار پر نہ ابن نصر بچتے، نہ ابن مندہ، اور نہ ان دونوں سے بڑے ائمہ۔ حق کی راہ دکھانے والا اللہ ہی ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے؛ سو ہم خواہشِ نفس اور درشت مزاجی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں[2]۔ "

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

" ابن خزیمہ کو اپنے علم، دین داری اور اتباعِ سنت کے باعث لوگوں کے دلوں میں بڑی عظمت اور جلالت حاصل تھی۔ ان کی کتاب التوحید ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے؛ اس کتاب میں انھوں نے حدیثِ صورت کی تاویل کی ہے؛ لہٰذا جو شخص بعض صفات کی تاویل کرے، اسے معذور سمجھنا چاہیے... اگر ہم ہر اس امام کی قدر و منزلت ساقط کر دیں اور اسے بدعتی قرار دے دیں جس سے اجتہاد میں خطا ہوئی ہو، دراں حالے کہ اس کا ایمان درست اور حق کی پیروی اس کا مقصود ہو، تو ائمہ میں بہت کم ہی لوگ ہمارے ساتھ بچیں گے۔ اللہ اپنے فضل و کرم سے سب پر رحمت فرمائے[3]۔ "

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

" ائمۂ علم میں سے کوئی بڑی شخصیت جس کی درست آرا زیادہ ہوں، حق کی جستجو میں جس کی دیانت مسلم ہو، جس کا علم وسیع، ذہانت نمایاں، صلاح و تقویٰ معروف اور اتباعِ سنت ثابت ہو[4]، اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اس سے درگزر کیا جائے گا۔ ہم نہ اسے گم راہ قرار دیں گے، نہ اس کی قدر

---

١ مجموع الفتاوى، ٣٢ / ٢٣٩.

٢ سير أعلام النبلاء، ١٤ / ٤٠.

٣ سير أعلام النبلاء، ١٤ / ٣٧٤-٣٧٦.

۴ اور نووی و ابن حجر سے زیادہ اس وصف کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟

ومنزلت ساقط کریں گے اور نہ اس کی خوبیوں کو فراموش کر دیں گے۔ ہاں، اس کی بدعت اور خطا میں اس کی پیروی نہیں کریں گے اور امید رکھیں گے کہ اللہ اُسے اس سے توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا[1]۔"

امام ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جسے شریعت اور حالاتِ واقعہ دونوں کا علم ہو، وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ کوئی جلیل القدر شخص جس کی اسلام میں قابلِ قدر خدمات ہوں، جس کے اچھے آثار باقی ہوں اور اہلِ اسلام میں جس کا بلند مقام ہو[2]، اس سے کبھی کوئی لغزش یا خطا سرزد ہو سکتی ہے جس میں وہ معذور ہو بل کہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اجر کا مستحق بھی ہو۔ ایسی صورت میں نہ اس خطا کی پیروی جائز ہے اور نہ یہ درست ہے کہ اس کی علمی عظمت، امامت اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کے مقام و مرتبے کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے[3]۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"شریعت اور حکمت کے مسلمہ اصولوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس شخص کی نیکیاں بہت زیادہ اور غیر معمولی ہوں اور اسلام میں اس کی خدمات نمایاں ہوں، اس کی بعض باتوں سے درگزر کیا جاتا ہے جب کہ دوسروں کی طرف سے وہ درگزر کے قابل نہیں ہوتیں اور اس کی بعض خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں جو دوسروں کی معاف نہیں کی جاتیں۔ گناہ ایک آلودگی ہے لیکن پانی جب دو قلوں کی مقدار کو پہنچ جائے تو آلودگی اسے متاثر نہیں کرتی[4]۔"

حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ نے اپنی کتاب کے سوا کسی کتاب کو خطا سے محفوظ نہیں رکھا۔ منصف وہ ہے جو کسی شخص کی بہت سی درست باتوں کے مقابلے میں اس کی تھوڑی سی خطا سے درگزر کرے[5]۔"

---

۱ سیر أعلام النبلاء، ۵ / ۲۷۱.

۲ اور نووی و ابن حجر سے زیادہ اس وصف کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟.

۳ أعلام الموقعین، ۵ / ۲۳۵.

۴ مفتاح دار السعادة ومنشور ولایة العلم والإرادة، ۱ / ۱۷٦.

۵ تقریر القواعد وتحریر الفوائد، ۱ / ۵٦.

امام سعدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اہلِ سنت والجماعت اشاعرہ اور تمام اہلِ بدعت کے ساتھ وہی سیدھا اور متوازن طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو شرعی اصولوں اور پسندیدہ قواعد پر قائم ہے۔ وہ ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور ان میں سے صرف اسی کو کافر قرار دیتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کافر قرار دیا ہو۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کسی شخص پر کفر یا ایمان کا حکم لگانا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خاص اور عظیم ترین حقوق میں سے ہے۔ چناں چہ اہلِ بدعت میں سے جو شخص رسول ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات، یا ان میں سے کسی حصے کا، کسی تاویل کے بغیر انکار کرے، وہ کافر ہے کیوں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور حق کے مقابلے میں تکبر اور عناد کا رویہ اختیار کیا۔ لہٰذا جہمی، قدری، خارجی، رافضی یا کسی اور بدعتی کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بدعت کتاب وسنت کی تعلیمات سے متصادم ہے، پھر بھی وہ اس پر اصرار کرے اور اس کی حمایت میں کھڑا ہو تو وہ اللہ عظیم کا منکر اور ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والا ہے۔

البتہ اہلِ بدعت میں سے جو شخص ظاہر و باطن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعظیم کرتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی پابندی کا عزم رکھتا ہو لیکن بعض مسائل میں حق سے ہٹ گیا ہو اور تاویل میں خطا کر بیٹھا ہو، نیز اس نے واضح ہدایت کا کفر و جحود کی بنا پر انکار نہ کیا ہو تو وہ کافر نہیں؛ تاہم وہ فاسق بدعتی، گم راہ بدعتی، یا پھر اس مسئلے کے مخفی ہونے اور حصولِ حق میں اس کے بھرپور اجتہاد کے باعث قابلِ معافی ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ حق تک پہنچ نہ سکا ہو۔ اسی لیے خوارج، معتزلہ، قدریہ اور دوسرے اہلِ بدعت مختلف درجوں اور قسموں میں تقسیم ہیں... بعض اہلِ بدعت ان سے کم درجے کے ہیں، جیسے بہت سے قدریہ، کلابیہ اور اشاعرہ۔ یہ لوگ ان اصولی مسائل میں بدعتی اور گم راہ ہیں جن میں انھوں نے کتاب وسنت کی مخالفت کی ہے اور یہ مسائل معروف و مشہور ہیں۔ لیکن اپنی بدعات میں ان کے درجے یک ساں نہیں؛ یہ تفاوت اس لحاظ سے ہے کہ وہ حق سے کتنے دور یا قریب ہیں؛ اہلِ حق کے خلاف تکفیر، تفسیق اور تبدیع میں کس قدر زیادتی کرتے ہیں اور حق تک رسائی کی کتنی صلاحیت رکھتے اور اس کی جستجو میں کتنا اجتہاد

کرتے ہیں، یا اس کے برعکس ان کا رویہ کیا ہے۔ اس موضوع کی تفصیل بہت طویل ہے۔[1]"

پس یہی اہلِ سنت والجماعت کا منہج ہے جو حق کو سب سے زیادہ جاننے والے اور مخلوق پر سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں۔ ان کے برخلاف دوسرے فرقوں نے اپنے مخالفین کی تکفیر میں حد سے تجاوز کیا کیوں کہ انھوں نے اپنے اختیار کردہ تصورات کو ایسے اصول قرار دے لیا جن کی مخالفت کرنے والا، خواہ کسی شبہے کی بنا پر ایسا کرے یا کسی اور سبب سے، ان کے نزدیک معذور نہیں سمجھا جاتا۔

چوتھی بنیادی غلطی: اپنی رائے پر بے جا اعتماد اور راسخ علما کی مخالفت کی جسارت

جب یہ لوگ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اشاعرہ، جہمیہ ہیں یا ان سے بھی بدتر، اور اسی بنا پر ان کی تکفیر کر ڈالی تو معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ وہ ایک چوتھی بنیادی غلطی کا شکار ہوئے جو خطرے میں گذشتہ غلطیوں سے کچھ کم نہیں اور اس منہج میں پائی جانے والی خرابی کی گہرائی کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ناقص فہم کو ان جلیل القدر ربانی علما کے اقوال پر مقدم کر دیا جو علم میں رسوخ رکھتے تھے۔

یہی چیز ان کے انحراف کی بنیاد اور گمراہی کی آخری کڑی بن گئی، یعنی علماے اشاعرہ کو نام بہ نام کافر قرار دینا؛ حالاں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے خود جہمیہ کے تمام معین افراد کے ساتھ بھی یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا تھا، اشاعرہ تو دور کنار۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان اشاعرہ کی بھی تکفیر نہیں کی جنھوں نے انھیں اذیتیں پہنچائیں اور قید میں ڈالا، دراں حالے کہ وہ ان کے مذہب اور اس کے انحرافات سے سب سے بڑھ کر واقف تھے۔

ان لوگوں کی طرف سے اہلِ سنت والجماعت کے اکابر علما کی مخالفت کی اس جسارت کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے آپ کو عقیدۂ سلف کی حفاظت میں ائمۂ سلف سے بھی زیادہ حریص سمجھتے ہیں، یا یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ اشاعرہ کو ان ربانی علما سے زیادہ جانتے ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ میل جول رکھا، ان سے بحث و مباحثہ کیا اور ان کے افکار و آرا کو اچھی طرح جانچا پرکھا تھا۔

قاری اس منہج کی سنگینی کا صحیح اندازہ کر سکے، اس لیے ذیل میں اہلِ سنت والجماعت کے اکابر ائمہ کی وہ تحسینی آرا جمع کی گئی ہیں جو انھوں نے اشاعرہ اور ان کے متعدد علما کے بارے میں دی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی غلطیوں میں بھی ان سے اتفاق کیا جائے بل کہ مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ علماے

1　توضيح الكافية الشافية، ص ٢٤٤-٢٤٦.

امت کے ایک بڑے طبقے پر بے محابا کفر کا حکم لگانے میں کس قدر شدید منہجی خرابی پائی جاتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جاہلوں کو علمائے مسلمین کی تکفیر کی کھلی چھوٹ دے دینا ایک بہت بڑا منکر ہے۔ اس فتنے کی اصل خوارج اور روافض کے ہاں پائی جاتی ہے جو ائمۂ مسلمین کو محض اس بنا پر کافر قرار دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں ان سے دین کے بعض مسائل میں خطا ہوئی ہے۔ اہل سنت والجماعت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ علمائے مسلمین کو محض کسی خطا کی بنا پر کافر قرار دینا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر شخص کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور اسے رد بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جس شخص کی کوئی بات اس کی خطا کے باعث رد کر دی جائے، ضروری نہیں کہ اسے کافر یا فاسق قرار دیا جائے بل کہ یہ بھی لازم نہیں کہ وہ گناہ گار ہو[1]۔"

علما کے بعض اقوال نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی قاری کے سامنے رکھ دیے جائیں تا کہ اسے اندازہ ہو سکے کہ ان لوگوں نے در حقیقت اہل سنت کے کن جلیل القدر ائمہ سے اختلاف کی جسارت کی ہے۔ میں نے یہاں تیمی اور وہابی مکتبِ فکر کے نمایاں علما کے اقوال پر اکتفا کیا ہے کیوں کہ عقیدے کی نگہ بانی اور حریم توحید کے دفاع میں ان کی غیر معمولی حساسیت اور اہتمام معروف ہے۔

انھوں نے حق کی نصرت اور مخالفین کی تردید کا فریضہ پوری قوت سے انجام دیا لیکن اس کے باوجود جہاں انصاف کی بات کہنے کا موقع آیا، وہاں عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اپنے مخالفین کی جو بات درست پائی، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور جہاں ان سے غلطی ہوئی، وہاں اس کی نشان دہی اور وضاحت بھی کر دی۔

ان علما کے نام یہ ہیں: ابن تیمیة، ابن عبدالهادی، ذهبی، ابن قیم، ابن کثیر، ابن رجب، حمد بن ناصر بن معمر، عبدالله بن امام محمد بن عبدالوهاب، عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخ، محمد بن ابراهیم آل الشیخ، ابن باز، ابن عثیمین اور اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والإفتاء (مستقل فتویٰ کمیٹی)۔

اگر یہی لوگ اقوالِ سلف کو سب سے زیادہ جاننے والے، انھیں صحیح طور پر سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھنے والے اور ان کے دفاع میں سب سے بڑھ کر سرگرم نہیں تھے تو پھر آج دنیا میں شاید کوئی شخص

---

1 مجموع الفتاوی، ۳۵ / ۱۰۰.

بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو سلفی کہلانے کا حق دار ہو۔ مگر جاہل اپنی حقیقت سے بے خبر ہو کر قد سے بڑا بننے لگتا ہے اور اپنے آپ کو عظیم سمجھ بیٹھتا ہے حالاں کہ تحقیق کی نظر میں اس کی مثال اس چیونٹی کی سی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو ہاتھی سے بھی بڑا خیال کرتی ہو!

اوّل: اشاعرہ کے بارے میں علما کی تحسینی آرا اور ان کا موقف

① امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"اشاعرہ کے کلام میں صحیح دلائل اور سنت کی موافقت کا جو سرمایہ پایا جاتا ہے، وہ عام متکلم فرقوں کے کلام میں نہیں ملتا۔ اہلِ کلام کے تمام گروہوں میں وہ سنت، جماعت اور حدیث سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ معتزلہ، روافض اور ان جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں انھیں اہلِ سنت والجماعت میں شمار کیا جاتا ہے بل کہ جن علاقوں میں اہلِ بدعت سے مراد معتزلہ، روافض اور ان جیسے دوسرے گروہ ہوں، وہاں یہی لوگ اہلِ سنت والجماعت سمجھے جاتے ہیں[1]۔"

ان کے بارے میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"جمہور مسلمانوں کے اتفاق کی رُو سے وہ فلسفی جہمیہ، معتزلہ اور ان جیسے دوسرے فرقوں کی بہ نسبت سنت اور حق سے زیادہ قریب ہیں[2]۔"

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

"ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی اسلام کے لیے قابلِ قدر کوششیں اور لائقِ تحسین خدمات نہ ہوں۔ انھوں نے بہت سے اہلِ الحاد و بدعت کی تردید اور اہلِ سنت و دین کی حمایت میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، وہ اس شخص سے مخفی نہیں رہ سکتے جو ان کے حالات سے واقف ہو اور ان کے بارے میں علم، صدق، عدل اور انصاف کے ساتھ گفت گو کرے[3]۔"

② اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء کے فتاویٰ میں ہے:

"اشاعرہ سے مراد ابوالحسن اشعری کے پیروکار اور عقیدے اور طرزِ استدلال میں ان کے مذہب کے

---

۱ بيان تلبيس الجهمية في تأسيس بدعهم الكلامية، ۳ / ۵۳۸.

۲ درء التعارض، ٦ / ۲۹۲.

۳ درء تعارض العقل والنقل، ۲ / ۱۰۱-۱۰۳.

حامی ہیں۔ ابوالحسن اشعری اور ان کے پیروکار تمام فرقوں میں اہلِ سنت والجماعت سے سب سے زیادہ قریب ہیں؛ چناں چہ جن امور میں وہ اہلِ سنت کے موافق ہیں، ان پر ان کی تحسین کی جائے گی اور جن امور میں انھوں نے ان سے اختلاف کیا ہے، ان میں انھیں خطا پر قرار دیا جائے گا[1]۔"

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے:

"اشاعرہ کافر نہیں ہیں، البتہ بعض صفات کی تاویل میں ان سے خطا ہوئی ہے[2]۔"

③ شیخ ابن باز فرماتے ہیں:

"اشاعرہ بیش تر امور میں اہلِ سنت میں شمار ہوتے ہیں لیکن صفات کی تاویل کے معاملے میں وہ اہلِ سنت کے منہج پر نہیں ہیں۔ وہ کافر نہیں بل کہ ان میں ائمہ، علما اور نیک لوگ بھی موجود ہیں، البتہ بعض صفات کی تاویل میں ان سے غلطی ہوئی ہے[3]۔"

سلفیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ امام نووی اور حافظ ابن حجر جیسے علما کی تکفیر کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ابن باز نے فرمایا:

"سلفی اہلِ علم میں کوئی ایسا نہیں جو مذکورہ علما کی تکفیر کرتا ہو۔ وہ صرف یہ واضح کرتے ہیں کہ بہت سی صفات کی تاویل میں ان سے کہاں خطا ہوئی اور یہ کہ ان کا یہ طرزِ عمل سلفِ امت کے مذہب کے خلاف ہے۔ اس تنقید کا مطلب نہ ان کی تکفیر ہے، نہ امت کے شیرازے کو منتشر کرنا اور نہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنا۔ اس کا مقصد تو اللہ اور اس کے بندوں کے ساتھ خیر خواہی، حق کی وضاحت اور نقلی وعقلی دلائل کی روشنی میں اس کے مخالفین کی تردید ہے[4]۔"

④ اشاعرہ کے متعلق علما کے طرزِ عمل کو نمایاں کرنے والے واقعات میں آلِ قدامہ کا صلاح الدین ایوبی کے پرچم تلے جہاد کرنا بھی شامل ہے، حالاں کہ صلاح الدین مذہبِ اشعری کے پیرو تھے اور انھوں نے اپنے عہد میں اشعری عقیدے کی تدریس کو لازم قرار دے رکھا تھا۔ شیخ ابو عمر محمد بن احمد بن قدامہ مقدسی

۱　فتاوى اللجنة الدائمة، المجموعة الثانية، برئاسة ابن باز، ٢ / ٤١٠-٤١١.

۲　فتاوى اللجنة الدائمة، المجموعة الأولى، برئاسة ابن باز، ٣ / ٢٢٠.

۳　مجموع فتاوى ابن باز، ٢٨ / ٢٥٦.

۴　مجموع فتاوى ومقالات متنوعة، ٣ / ٧٢.

کے بارے میں ابن کثیر لکھتے ہیں:

"وہ شیخ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ کے بھائی تھے اور عمر میں ابو عمر اِن سے بڑے تھے... وہ، ان کے بھائی، ان کے خالہ زاد بھائی حافظ عبد الغنی اور ان کے بھائی شیخ عماد، صلاح الدین ایوبی کی کسی ایسی جنگی مہم سے پیچھے نہیں رہتے تھے جو وہ بلادِ فرنگ کی طرف لے کر نکلتے۔ انھوں نے ان کے ساتھ بیت المقدس اور دوسرے علاقوں کی فتوحات میں بھی شرکت کی[1]۔"

حافظ ابن تیمیہ نے صلاح الدین ایوبی کو اہلِ سنت کے حکم رانوں میں شمار کیا ہے حالاں انھیں یقینی طور سے معلوم تھا کہ صلاح الدین اشعری تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... پھر اس کے انتقال کے بعد اسے اہلِ سنت کے حکم رانوں نے فتح کیا جن میں صلاح الدین بھی شامل تھے۔ اس کے بعد وہاں روافض کے مقابلے میں سنت کا غلبہ ہوا اور علم و سنت روز افزوں ترقی کرتے اور نمایاں ہوتے چلے گئے[2]۔"

دوم: اشاعرہ کے بعض معین علما کے بارے میں علمائے اہلِ سنت والجماعت کی تحسینی آرا

اشاعرہ کے علما مختلف علوم میں بڑی تعداد میں گزرے ہیں لیکن یہاں ہماری بحث ان نمایاں شخصیات سے ہے جنھوں نے حدیث، فقہ اور دوسرے شرعی علوم میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ اس مقام کی گنجایش کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ان میں سے چھ علما کا ذکر کیا جائے گا: بیہقی، ابن الصلاح، عزبن عبد السلام، نووی، ابن دقیق العید اور ابن حجر عسقلانی۔

① حافظ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی (۴۵۸ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں:

"حافظ ابو بکر بیہقی اور ان جیسے علما، اشعری کے بہت سے متاخر پیروکاروں کی بہ نسبت سنت سے زیادہ قریب ہیں[3]۔"

---

۱ البداية والنهاية، ۱۷ / ۲۰-۲۱.

۲ مجموع الفتاوى، ۳ / ۲۸۱.

۳ شرح العقيدة الأصفهانية، ص ۱۲۷.

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"بیہقی، اصحابِ شافعی میں حدیث کے سب سے بڑے عالم اور امام شافعی کے مذہب کے سب سے بڑھ کر حامی تھے[1]۔"

ابن عبد الہادی کہتے ہیں:

"بیہقی امام، حافظ، علامہ اور شیخ خراسان تھے؛ انھوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جن کی نظیر ان سے پہلے موجود نہ تھی؛ ان میں السنن الکبیر اور السنن الصغیر... شامل ہیں[2]۔"

ذہبی ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"وہ حافظ، علامہ، ثبت، فقیہ اور شیخ الاسلام ابو بکر تھے؛ اللہ نے ان کے علم میں برکت عطا فرمائی اور انھوں نے نہایت نافع کتابیں تصنیف کیں۔ پھر وہ اپنے گاؤں میں یک سو ہو کر جمع و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ بیہقی چاہتے تو اپنے لیے ایک مستقل مذہب قائم کر سکتے تھے اور اس میں اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے تھے کیوں کہ ان کے علوم نہایت وسیع اور علما کے اختلافات پر ان کی نظر گہری تھی۔ اسی بنا پر آپ دیکھتے ہیں کہ جن مسائل میں حدیث صحیح ہوتی ہے، وہ ان کی تائید کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں[3]۔"

ایک اور مقام پر ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"شافعی کی نصوص کو اولاً انھوں نے ہی یک جا کیا اور کتاب و سنت سے ان کے دلائل فراہم کیے[4]۔"

ابن کثیر ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ اکابر حفاظ میں سے تھے۔ ان کی تصانیف کو ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ تمام شہروں اور ملکوں میں ان کا چرچا پھیل گیا[5]۔"

---

۱ مجموع الفتاوی، ۳۲ / ۲۴۰.

۲ طبقات علماء الحديث، ۳ / ۳۲۹.

۳ سير أعلام النبلاء، ۱۸ / ۱۶۳-۱۶۹.

۴ تاريخ الإسلام، ۱۰ / ۹۵.

۵ البداية والنهاية، ۱۶ / ۹.

③ شیخ ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمٰن ابن الصلاح (٦٤٣ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

حافظ ابن تیمیہ نے ابن الصلاح سے بہ کثرت نقل کیا ہے اور بالعموم انھیں "شیخ" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ ابو عمرو ابن الصلاح نے کہا"، اور: "شیخ ابو عمرو ابن الصلاح کا موقف یہ تھا[1]۔"

علامہ ابن عبد الہادی کہتے ہیں:

"ابن الصلاح امام، حافظ، شیخ الاسلام اور تقی الدین[2]۔"

حافظ ذہبی ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"امام، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام، تقی الدین؛ انھوں نے درس و تدریس اور افتا کی خدمت انجام دی، علمی ذخیرے جمع کیے اور کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تربیت سے اصحابِ علم کی ایک جماعت تیار ہوئی اور وہ اکابر ائمہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں غیر معمولی جلالت، وقار و ہیبت، فصاحت اور علمِ نافع حاصل تھا[3]۔"

حافظ ابن قیم کہتے ہیں:

"روزے دار کے منھ کی اس خوش بو کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ دنیا میں ظاہر ہوتی ہے یا آخرت میں؟ اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ اس بارے میں دو فاضل شیوخ، ابو محمد ابن عبد السلام اور ابو عمرو ابن الصلاح کے درمیان اختلاف ہوا تھا[4]۔"

امام ابن کثیر کہتے ہیں:

"وہ امام، علامہ، مفتیِ اسلام، تقی الدین ابو عمرو ہیں۔ وہ فلسفے اور منطق کے طریقوں کو ناپسند کرتے، ان کی تحقیر کرتے اور شہر میں ان کی تعلیم کی اجازت نہ دیتے تھے۔ حکم ران بھی اس معاملے میں ان کی

---

١ دیکھیے: شرح العقيدة الأصفهانية، ص ١٨٤؛ نقض المنطق، ص ٩٤؛ بيان تلبيس الجهمية، ٨ / ٤٨٧، وغیرہ۔

٢ طبقات علماء الحديث، ٤ / ٢١٤.

٣ سير أعلام النبلاء، ٢٣ / ١٤٠-١٤٣. نیز دیکھیے: تاريخ الإسلام، ١٤ / ٤٥٥-٤٥٧.

٤ الوابل الصيب، ص ٥٨.

بات مانتے تھے[1]۔"

ابن رجب انھیں "حافظ تقی الدین ابن الصلاح" کہتے ہیں[2]۔

محمد بن ابراہیم آل الشیخ نے انھیں "علامہ ابن الصلاح" کے لقب سے یاد کیا ہے[3]۔

(۳) فقیہ عبدالعزیز بن عبدالسلام (۶۶۰ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں:

"ہمارے فاضل عالم رفیق ابو بکر ابن سالار نے مجھ سے بیان کیا، انھوں نے اپنے عہد کے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید سے اور انھوں نے امام ابو محمد ابن عبد السلام سے نقل کیا کہ جب ابن عربی مصر آیا تو لوگوں نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا: وہ ایک برا شیخ، جھوٹا اور قابلِ مذمت شخص ہے[4]۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"میں نے فقیہ ابو محمد ابن عبد السلام کے فتاویٰ میں دیکھا، وہ کہتے ہیں...[5]۔"

علامہ ذہبی کہتے ہیں:

"وہ شیخ الاسلام اور جلیل القدر ائمہ کی یادگار تھے۔ انھوں نے درس دیا، فتویٰ نویسی کی، کتابیں تصنیف کیں، فقہِ مذہب میں کمال حاصل کیا اور درجۂ اجتہاد تک پہنچ گئے۔ وہ امام، زاہد، متقی اور عبادت گزار تھے؛ نیکی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرتے تھے[6]۔"

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

---

۱ طبقات الشافعيين، ص ۸۵۷-۸۵۸.

۲ ذيل طبقات الحنابلة، ابن رجب، ۲ / ۳۱۹.

۳ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ۱۵ / ۱۰۴.

۴ مجموع الفتاوى، ۲ / ۲۴۴.

۵ مجموع الفتاوى، ۱ / ۳۴۷.

۶ تاريخ الإسلام، ۱۴ / ۹۳۳-۹۳۵.

"وہ امام، علامہ اور اپنے عہد کے یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، عربی، اصول، مذاہب و علما کے اختلافات، لوگوں کے اقوال اور ان کے ماخذ، غرض مختلف علوم میں حیرت انگیز جامعیت پیدا کرلی تھی، یہاں تک کہ کہا گیا کہ وہ درجۂ اجتہاد تک پہنچ گئے تھے[1]۔"

حافظ ابن رجب فرماتے ہیں:

"اکابر مشائخ علما، جیسے ابن الصلاح اور ابن عبد السلام...[2]۔"

ایک اور مقام پر انھیں یوں یاد کرتے ہیں:

"شیخ عزالدین ابن عبد السلام، شافعیہ کے شیخ تھے[3]۔"

شیخ حمد بن ناصر بن معمر (۱۲۲۵ھ) نے بھی انھیں فقیہ کہا ہے؛ وہ لکھتے ہیں:

"اس مسئلے کا ذکر فقیہ ابو محمد عزبن عبد السلام نے اپنے فتاویٰ میں کیا ہے[4]۔"

اسی طرح شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب (۱۲۴۲ھ) نے بھی انھیں فقیہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"شیخ ابو محمد ابن عبد السلام، فقیہ شافعی[5]۔"

④ امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی (۶۷۶ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر امام نووی کو منصبِ امامت سے یاد کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"امام ابوزکریا یحییٰ نووی رحمہ اللہ" اور "امام نووی نے فرمایا[6]۔"

حافظ ابن عبد الہادی کہتے ہیں:

"وہ امام، فقیہ، یگانۂ روزگار حافظ، مقتدا اور زاہد تھے[7]۔"

---

۱ طبقات الشافعيين، ص ۸۷۳-۸۷۵.
۲ ذيل طبقات الحنابلة، ٤ / ٦٩.
۳ ذيل طبقات الحنابلة، ٢ / ١٩٢.
۴ مجموعة الرسائل والمسائل النجدية، الجزء الرابع، القسم الثاني، ص ٦٢٣.
۵ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ١٠ / ٢٦٢.
۶ دیکھیے: مجموع الفتاوى، ٨ / ٣٨٢؛ الإيمان الأوسط، ص ٥٨١.
۷ طبقات علماء الحديث، ٤ / ٢٥٤.

علامہ ذہبی ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"وہ مفتیِ امت، شیخ الاسلام، حافظ، فقیہ، شافعی اور زاہد تھے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصانیف سے امت کو نفع پہنچایا۔ وہ دور دور کے علاقوں میں پھیلیں اور مختلف شہروں میں پہنچیں[1]۔"

ایک اور مقام پر انھیں یوں یاد کرتے ہیں:

"امام، یگانہ روزگار حافظ، مقتدا اور شیخ الاسلام ...[2]۔"

حافظ ابن قیم نے بھی اپنی کتاب جلاء الافہام میں متعدد مقامات پر انھیں "شیخ" کے لقب سے یاد کیا ہے[3]۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں:

"وہ علامہ، شیخ المذہب اور اپنے زمانے کے اکابر فقہا میں سے تھے۔ زہد، عبادت، ورع اور احتیاط ایسی خوبیوں کے ساتھ ساتھ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر یک سوئی اختیار کرنے میں انھیں ایسا بلند مقام حاصل تھا جس تک دوسرے فقہا کی رسائی نہ تھی۔ وہ اپنے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہ کرتے تھے۔ دمشق میں قیام کے دوران انھوں نے حج بھی کیا۔ وہ بادشاہوں اور دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے تھے[4]۔"

ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں:

"وہ شیخ، امام اور علامہ، مذہب کے محقق و منقح، اس کے مسائل کو ضبط اور ترتیب دینے والے تھے[5]۔"

حافظ ابن رجب اپنی شرحِ اربعین نووی کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"امام حافظ ابو عمرو ابن الصلاح نے ایک مجموعہ املا کرایا جس کا نام الاحادیث الکلیہ رکھا۔ اس میں انھوں نے وہ جامع احادیث جمع کیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دین کا مدار انھی پر ہے، نیز انھی کے مفہوم کی حامل مختصر اور جامع باتیں بھی شامل کیں۔ ان کا یہ مجموعہ چھبیس احادیث پر مشتمل تھا۔ پھر

---

١ تاريخ الإسلام، ١٥ / ٣٢٤-٣٣٢.

٢ تذكرة الحفاظ، ٤ / ١٧٤.

٣ جلاء الأفهام، ص ٥٤٥؛ ص ٢٣٩.

٤ البداية والنهاية، ١٧ / ٥٤٠-٥٤١

٥ طبقات الشافعيين، ص ٩٠٩-٩١٣.

فقیہ، امام، زاہد اور مقتدا ابوزکریا یحییٰ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن الصلاح کی جمع کردہ ان احادیث کو لیا اور ان میں مزید احادیث شامل کر کے تعداد بیالیس تک پہنچادی۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام الاربعین رکھا۔ ان کی جمع کردہ یہ چالیس احادیث ایسی مشہور ہوئیں کہ لوگوں نے انھیں کثرت سے حفظ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جامع کی نیت کے اخلاص اور حسنِ قصد کی برکت سے اس مجموعے کو غیر معمولی نفع عطا فرمایا؛ اللہ ان پر رحمت فرمائے[1]۔"

شیخ حمد بن ناصر بن معمر (۱۲۲۵ھ) کہتے ہیں:

"امام نووی رحمہ اللہ کے بیان کردہ اس باب پر غور کیجیے؛ وہ شافعیہ کے امام علی الاطلاق ہیں[2]۔"

علامہ عبد اللہ بن امام محمد بن عبد الوہاب (۱۲۴۲ھ) لکھتے ہیں:

"اللہ امام نووی کو جزاے خیر دے کہ انھوں نے کتاب الاذکار جمع کی۔ جو شخص اذکار کا اہتمام کرنا چاہتا ہو، اسے اس کتاب سے وابستہ رہنا چاہیے کیوں کہ توفیق یافتہ آدمی کے لیے یہ کافی ہے[3]۔"

شیخ عبد الرحمٰن بن حسن آلِ شیخ (۱۲۸۵ھ) فرماتے ہیں:

"دیکھیے، امام نووی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اکثر محققین کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ خوارج کو محض ان کی بدعت کی بنا پر کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس امام کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے[4]۔"

علامہ محمد بن ابراہیم آلِ شیخ لکھتے ہیں:

"جیسا کہ امام ابوزکریا نووی اور دوسرے علما نے ذکر کیا ہے[5]۔"

شیخ ابن باز کہتے ہیں:

"عام لوگوں کے لیے مفید بہترین مختصر کتابوں میں امام نووی رحمہ اللہ کی ریاض الصالحین اور امام حافظ

---

۱ جامع العلوم والحكم، ۱ / ۵۶.
۲ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ۱۰ / ۳۱۳.
۳ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ٤ / ۳۱۹.
۴ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ۸ / ۲۷۰.
۵ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ۱۵ / ۳۰۱.

ابن حجر کی بلوغ المرام شامل ہیں۔ یہ دونوں نہایت مفید اور نفع بخش کتابیں ہیں۔ ان کا اہتمام کرنا، انھیں حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے[1]۔"

علامہ ابن عثیمین شرحِ ریاض الصالحین کے آغاز میں کہتے ہیں:

"ریاض الصالحین، جسے شیخ حافظ نووی رحمہ اللہ نے تصنیف کیا ہے، ایک عمدہ کتاب ہے؛ مصنف رحمہ اللہ نے اس کتاب سے فائدہ اٹھانے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کے لیے، ان کے والدین کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کریں۔ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انھیں، ان کے والدین اور تمام مسلمانوں کو بخش دے اور ہمیں، انھیں اور اپنے تمام مومن بھائیوں کو اپنے دارِ کرامت میں جمع فرمائے۔ بے شک وہ نہایت سخی اور کریم ہے[2]۔"

شیخ ابن عثیمین شرحِ اربعین نووی کے آغاز میں کہتے ہیں:

"حافظ نووی رحمہ اللہ، امام شافعی کے ان اصحاب میں سے ہیں جن کی آرا کو معتبر مانا جاتا ہے۔ وہ شافعی علما میں تصنیف و تالیف سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف فنون میں کتابیں تصنیف کیں؛ حدیث اور علومِ حدیث میں تصنیفات کے علاوہ علمِ لغت میں تہذیب الاسماء واللغات جیسی کتاب لکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت وسیع العلم تھے۔ بہ ظاہر، واللہ اعلم، تصنیف و تالیف میں نہایت مخلص لوگوں میں سے تھے کیوں کہ ان کی کتابیں پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئیں۔ شاید ہی کوئی مسجد ایسی ملے جہاں ریاض الصالحین نہ پڑھی جاتی ہو۔ ان کی دوسری کتابیں بھی پوری دنیا میں معروف و متداول ہیں۔ یہ ان کے حسنِ نیت کی دلیل ہے کیوں کہ لوگوں میں کسی مصنف کی کتابوں کو قبولِ عام حاصل ہونا اخلاصِ نیت کی علامت ہے۔

آں رحمہ اللہ مجتہد تھے اور مجتہد سے خطا بھی ہوتی ہے اور درستی بھی۔ اسماء وصفات کے بعض مسائل میں ان سے خطا ہوئی کہ انھوں نے بعض صفات کی تاویل کی لیکن ان کا انکار نہیں کیا۔ بعض نصوصِ صفات کی تاویل میں ان کی یہ خطا انکے بے شمار فضائل اور عظیم علمی خدمات میں دب کر رہ جاتی ہے۔ ہمارا گمان یہی ہے کہ ان سے جو کچھ صادر ہوا، وہ اجتہاد اور ایسی تاویل کی بنا پر تھا جو کم از کم ان کی رائے

---

۱ مجموع فتاوی ابن باز، ۱۷ / ۱۵۱.

۲ شرح رياض الصالحين، ۱ / ۱۱-۱۲.

میں قابلِ قبول تھی۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ خطا معاف کر دی جائے گی اور انھوں نے خیر اور نفع کا جو کام انجام دیا، وہ ایک قابلِ قدر سعی قرار پائے گا۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ "یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں"۔ [ہود: ۱۱۴] امام نووی کے حالات میں سے جو کچھ ہمارے علم میں ہے، اس کی بنا پر ہم ان کے صالح ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ مجتہد تھے اور ہر مجتہد سے درستی بھی ہو سکتی ہے اور خطا بھی۔ اگر وہ خطا کرے تو اسے ایک اجر ملتا ہے اور اگر درست رائے تک پہنچے تو اسے دو اجر ملتے ہیں[1]۔"

⑤ ابو الفتح محمد بن علی بن دقیق العید قشیری (۷۰۲ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"شیخ، امام، قاضی القضاۃ، تقی الدین ابن دقیق العید[2]۔"

حافظ ابن عبد الہادی کہتے ہیں:

"وہ امام، فقیہ، حافظ، یگانۂ روزگار علامہ شیخ تقی الدین تھے[3]۔"

محدث ذہبی رقم طراز ہیں:

"ابن دقیق العید امام، فقیہ، مجتہد، محدث، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام تقی الدین تھے۔ وہ اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا علم وسیع تھا اور کتابوں کا ذخیرہ فراواں؛ شب بیداری ان کا معمول تھی اور علمی مشاغل میں ان کا انہماک ہمہ وقتی تھا۔ نہایت متین، باوقار اور صاحبِ ورع تھے۔ آنکھوں نے کم ہی ان جیسا کوئی شخص دیکھا ہوگا[4]۔"

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"وہ شیخ، امام، عالم، علامہ اور حافظ تھے۔ انھوں نے بہ کثرت حدیثیں سنیں، طلبِ علم کے لیے سفر کیے، احادیث کی تخریج کی اور اسناد و متون، دونوں کے باب میں متعدد منفرد اور نفع بخش کتابیں

---

۱ شرح الأربعين النووية، ص ۳-٤

۲ جامع المسائل، ۹ / ۷۲.

۳ طبقات علماء الحديث، ٤ / ۲٦٥.

۴ تذكرة الحفاظ، ٤ / ۱۸۱-۱۸۲.

تصنیف کیں۔ اپنے عہد میں مسندِ علم کی سیادت انھی پر آ ٹھہری اور وہ اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے[1]۔"

علامہ ابن رجب انھیں "علامہ ابو الفتح ابن دقیق العید" کہتے ہیں[2]۔"

انھوں نے ابن دقیق العید کو اکابر ائمہ میں بھی شمار کیا ہے، احمد بن عبد الدایم مقدسی کے تذکرے میں لکھا:

"ان سے اکابر ائمہ اور متقدم و متاخر حفاظ نے روایت کی۔ ان میں شیخ محی الدین نووی، شیخ شمس الدین ابن ابی عمر، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید، شیخ تقی الدین ابن تیمیہ اور ایک بڑی جماعت شامل ہے[3]۔"

شیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ (۱۲۸۵ھ) نے انھیں "شیخ الاسلام" کے لقب سے یاد کیا ہے[4]۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

"امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہی عمدہ بات کہی ہے[5]۔"

⑥ حافظ ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کے بارے میں علما کی تحسینی آرا

شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب (۱۲۴۲ھ) کہتے ہیں:

"ہم کتابِ اللہ کو سمجھنے کے لیے ان معتبر اور متداول تفاسیر سے مدد لیتے ہیں؛ اور حدیث کے فہم میں ممتاز ائمہ کی شروح سے استفادہ کرتے ہیں، مثلاً صحیح بخاری پر عسقلانی اور قسطلانی کی شرحیں، صحیح مسلم پر نووی کی شرح اور الجامع الصغیر پر مناوی کی شرح[6]۔"

شیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ (۱۲۸۵ھ) نے ریشم کی آمیزش والے لباس کے مسئلے میں ابن حجر کے قول سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں کہتا ہوں کہ حافظ نے فتح الباری میں دلائل کے ساتھ اس مسئلے کی وضاحت کی ہے؛ یہ اپنے عہد

---

۱ البداية والنهاية، ۱۸ / ۲۹-۳۱.

۲ ذيل طبقات الحنابلة، ٤ / ٨٢.

۳ ذيل طبقات الحنابلة، ابن رجب، ٤ / ٩٩.

۴ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ٤ / ٢٤١.

۵ مجموعة الرسائل والمسائل النجدية، ١ / ٤٣٦

۶ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ١ / ٢٢٨.

کے حافظِ دنیا ہیں اور انھوں نے ریشم کی آمیزش والے لباس کے حرام ہونے کی صراحت کی ہے[1]۔"

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء کے فتاویٰ میں ہے:

"ابوزکریا یحییٰ نووی، ابن حجر عسقلانی اور ان جیسے دوسرے علما جنھوں نے صفاتِ الٰہی کی نصوص کی تاویل کی یا ان کے اصل معنی میں تفویض کا مسلک اختیار کیا، ہمارے نزدیک اکابر علمائے مسلمین میں سے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے امت کو نفع پہنچایا۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے اور انھیں جزائے خیر عطا کرے[2]۔"

علامہ ابن باز سے سوال کیا گیا کہ بعض لوگ امام نووی اور ابن حجر رحمہا اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے خبردار کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ دونوں اہلِ سنت والجماعت میں سے نہیں تھے۔ اس بارے میں صحیح موقف کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا:

"ابن حجر، نووی اور بعض دوسرے علما سے صفات کے چند مسائل میں غلطی ہوئی ہے۔ ان مسائل میں وہ اہلِ سنت کے منہج پر نہیں، البتہ جن امور میں ان کا موقف درست رہا اور انھوں نے تحریف سے کام نہیں لیا، ان میں وہ اور ان جیسے دوسرے علما اہلِ سنت ہی میں شمار ہوتے ہیں[3]۔"

اشعری علما کے لیے دعائے رحمت اہلِ سنت کی کتابوں میں اس کثرت سے منقول ہے کہ تراجم، وفیات اور دوسرے موضوعات پر ان کی تصانیف اس سے بھری پڑی ہیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ ان علما کو مسلمان تسلیم کرتے اور انھیں اہلِ قبلہ کے دائرے سے خارج نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ کافر کے لیے دعائے رحمت بالاجماع جائز نہیں۔ مغفرت اور رحمت کی دعا صرف اسی شخص کے لیے کی جا سکتی ہے جو اسلام پر فوت ہوا ہو، خواہ اس کے ہاں کوئی بدعت یا اعتقادی خطا پائی جاتی ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص منہجِ سلف کا علم بردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کے لیے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ وہ علم میں رسوخ رکھنے والے علما کی اس پوری جماعت کے اقوال سے منھ موڑ لے، انھیں بے وقعت سمجھے، ان پر اپنے اجتہاد کو ترجیح دے اور صرف اسی بات کو قبول کرے جسے اس کا محدود فہم پسند کرے؟

۱　الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ٤ / ٢٥١.

۲　فتاوى اللجنة الدائمة، المجموعة الثانية، برئاسة ابن باز، ٢ / ٤١٠-٤١١.

۳　مجموع فتاوى ابن باز، ٢٨ / ٤٧.

اختتام سے پہلے اس امر کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے کہ غلو کسی ایک فریق کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جس طرح اہل سنت والجماعت سے نسبت رکھنے والوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے غلو کی راہ اختیار کی اور اشاعرہ کو کافر قرار دیا، اسی طرح اشاعرہ کی صفوں میں، اور ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے غلو کرتے ہوئے اہل سنت اور اثباتِ صفات کے قائلین کی تکفیر کی اور انھیں تجسیم کا ملزم ٹھیرایا بل کہ بعض اکابر علمائے اہل سنت والجماعت کو نام بہ نام کافر قرار دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں سے درجنوں افراد نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تکفیر کی۔ جس طرح اہل سنت میں انصاف سے کام لینے والے علما موجود رہے ہیں، اسی طرح اشاعرہ میں بھی ایسے اہل علم گزرے ہیں جنھوں نے عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھا۔

انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں اشاعرہ کے تین معروف علما کے وہ تحسینی کلمات بھی نقل کر دیے جائیں جو انھوں نے اپنے سب سے بڑے حریف، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، کے بارے میں کہے ہیں۔

① علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

"جب میری ملاقات ابن تیمیہ سے ہوئی تو میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے سامنے تمام علوم حاضر تھے؛ ان میں سے جس علم سے چاہتے، استفادہ کرتے اور جسے چاہتے، چھوڑ دیتے[1]۔"

ایک مرتبہ انھوں نے ابن تیمیہ سے کہا:

"مجھے گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اب بھی تم جیسا شخص پیدا فرماتا ہے[2]۔"

② حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کی امامت کی شہرت آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ انھیں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرنا آج تک پاکیزہ زبانوں پر جاری ہے اور جو بات کل مسلم تھی، آیندہ بھی اسی طرح مسلم رہے گی۔ اس حقیقت کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو ان کے مقام سے ناواقف اور انصاف سے بے گانہ ہو۔ جس نے یہ جسارت کی، اس نے کتنی بڑی خطا کی اور کیسی گرد اڑائی! پس اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنے نفس کے شر اور اپنی زبانوں کی کاٹ سے محفوظ رکھے۔

---

۱ حوالہ سابق.

۲ الرد الوافر، ابن ناصر الدین، ص ٦٠.

اگر اس شخص کی فضیلت میں صرف یہی بات ہوتی جس کی نشان دہی مشہور حافظ علم الدین برزالی نے اپنی تاریخ میں کی ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کسی شخص کے جنازے میں اتنا جم غفیر جمع نہیں ہوا جتنا شیخ تقی الدین کے جنازے میں ہوا تھا تو یہی ان کی عظمت کے لیے کافی تھی۔ اس عظیم اجتماع کا باعث صرف ان کی امامت اور برکت پر لوگوں کا اعتقاد تھا؛ نہ کسی سلطان نے انھیں جمع کیا تھا اور نہ کسی اور نے۔ نبی ﷺ سے صحیح طور پر منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔[1]"

علامہ ابن حجر نے ان اشعری علما پر بھی سخت نکیر کی جنھوں نے ابن تیمیہ کی تکفیر کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"جو شخص ابن تیمیہ کو کافر قرار دے، اس کی نکیر کیوں نہ کی جائے؟ بل کہ اس شخص کی بھی جو کسی کو محض اس بنا پر کافر کہے کہ اس نے ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہا ہے۔ انھیں اس لقب سے یاد کرنے میں آخر کون سی ایسی بات ہے جو کفر کو لازم کرتی ہو؟ بلاشبہ وہ اپنے عہد میں شیوخِ اسلام کے شیخ تھے۔ جن مسائل میں ان پر اعتراض کیا گیا، وہ انھیں خواہشِ نفس کے زیرِ اثر بیان نہیں کرتے تھے اور نہ دلیل واضح ہو جانے کے بعد محض عناد کی بنا پر ان پر اصرار کرتے تھے۔ ان کی تصانیف ان لوگوں کی تردید اور ان سے اظہارِ براءت سے بھری پڑی ہیں جو تجسیم کے قائل ہیں۔ اس کے باوجود وہ بشر تھے؛ ان سے درستی بھی ہوتی تھی اور خطا بھی۔ ان کی درست باتوں سے، جو ان کے کلام کا بیش تر حصہ ہیں، فائدہ اٹھایا جائے گا اور انھی خدمات کے باعث ان کے لیے رحمت کی دعا کی جائے گی۔ جن باتوں میں ان سے خطا ہوئی، ان میں ان کی تقلید نہیں کی جائے گی، البتہ وہ معذور ہیں، کیوں کہ علمائے شریعت نے گواہی دی ہے کہ اجتہاد کے تمام ضروری وسائل ان میں جمع تھے۔۔۔

تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ یہی شخص روافض، حلولیہ اور اتحادیہ جیسے اہلِ بدعت کے مقابلے میں سب سے بڑھ کر سینہ سپر رہا۔ اس موضوع پر اس کی تصانیف بہ کثرت اور معروف ہیں اور ان فرقوں کے خلاف اس کے فتاویٰ کا شمار ممکن نہیں۔ پھر جب وہ اپنی تکفیر کی خبر سنتے ہوں گے تو ان کی آنکھیں کیسی ٹھنڈی ہوتی ہوں گی! اور جب اہلِ علم میں سے کسی کو اس کی تکفیر کرتے دیکھتے ہوں گے تو ان کی خوشی کا کیا عالم ہوتا ہوگا!

اگر شیخ تقی الدین کے فضائل میں صرف ان کے مشہور شاگرد شیخ شمس الدین ابن قیم الجوزیہ ہی

---

1 تقریظ لابن حجر علی الرد الوافر، ص ١٢-١٥.

ہوتے جن کی نافع اور دل آویز تصانیف سے موافق و مخالف سبھی نے فائدہ اٹھایا، تو ان کے بلند مرتبے کی دلیل کے لیے یہی کافی تھا۔ پھر اس صورت میں کیا کہا جائے جب حنبلی علما تو در کنار، ان کے عہد کے شافعی اور دوسرے ائمہ ان کی علمی برتری اور الفاظ کے صریح و مضمر معانی میں امتیاز کی غیر معمولی صلاحیت کی گواہی دے چکے ہیں!

ان تمام حقائق کے باوجود جو شخص انھیں کافر قرار دے، یا اس شخص کی تکفیر کرے جو انھیں شیخ الاسلام کہتا ہو، اس کی بات کسی التفات کے لائق نہیں اور نہ اس معاملے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے بل کہ اسے اس روش سے روکنا لازم ہے یہاں تک کہ وہ حق کی طرف رجوع کرے اور درست بات کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اللہ ہی حق فرماتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے؛ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے[1]۔"

ابن حجر نے اپنی کتاب الدرر الکامنة فی أعیان المائة الثامنة میں ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن عبد اللہ بن ابی القاسم ابن تیمیہ حرانی، پھر دمشقی حنبلی، تقی الدین ابو العباس؛ انھوں نے فقہ میں مہارت حاصل کی، کمال پیدا کیا، امتیازی مقام پایا اور اپنے معاصرین سے آگے نکل گئے۔ کتابیں تصنیف کیں، درس دیا اور فتوے صادر کیے۔ وہ اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے اور سرعتِ استحضار، قوتِ قلب، منقول و معقول علوم میں وسعت اور مذاہبِ سلف و خلف پر گہری نظر کے اعتبار سے ایک عجوبۂ روزگار بن گئے[2]۔"

④ سیوطی نے اپنی کتاب طبقات الحفاظ میں ابن تیمیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ابن تیمیہ شیخ، امام، علامہ، حافظ، ناقد، فقیہ، مجتہد، ممتاز مفسر، شیخ الاسلام، زاہدوں کے پیشوا اور اپنے عہد کی نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ ان کا نام تقی الدین ابو العباس احمد بن مفتی شہاب الدین عبد الحلیم بن امام مجتہد شیخ الاسلام مجد الدین عبد السلام تھا۔ وہ علم کے بحرِ بے کراں، نام ور اصحابِ ذہانت، زاہدوں اور یگانۂ روزگار شخصیات میں سے تھے۔ انھوں نے تین سو جلدیں تصنیف کیں، آزمائشوں

---

۱ حوالہ سابق۔ یہ تقریظ حافظ ابن حجر نے اپنے ہاتھ سے لکھی، اور اسے ان کے شاگرد سخاوی نے اپنی کتاب الجواہر والدرر، ۲/ ۷۳۶ میں مکمل نقل کیا ہے۔

۲ الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة، ١ / ١٦٨.

سے گزرے اور بارہا اذیتیں اٹھائیں[1]۔"

خاتمۂ بحث

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مخالفین کے ساتھ عدل اور اہلِ علم کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا جائے؛ یہی منہجِ حق کا تقاضا ہے۔ اشاعرہ نے مفید علوم اور دینِ الٰہی کی گراں قدر خدمات کا جو سرمایہ چھوڑا ہے، اس کا انکار نہ کیا جائے اور اس کے ساتھ عقائد اور صفات کے ابواب میں ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ان پر خاموشی بھی اختیار نہ کی جائے۔ توفیق یافتہ وہی ہے جو منہجِ سلف پر چلتے ہوئے تنقید کرے مگر جرحِ ناروا سے بچے؛ تحسین کرے لیکن غلو میں مبتلا نہ ہو؛ حق کو واضح اور باطل کو رد بھی کرے اور اہلِ علم کے مقام و مرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا بھی کرتا رہے۔

انصاف دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اشاعرہ کو یک قلم ساقط کر دیا، ان کی تمام علمی کاوشوں کو بے وقعت ٹھیرایا اور ان کے صالح علما کو بدعتی، گم راہ بل کہ کافر قرار دیا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اشاعرہ کے بارے میں ایسا غلو کیا کہ انھی کے مذہب کو سراسر حق اور انھی کو اہلِ سنت والجماعت قرار دے دیا، یا کم از کم انھیں اہلِ سنت والجماعت میں شمار کیا[2]، یا یہ سمجھا کہ ان کی غلطیوں پر خاموشی ہی عافیت کی راہ ہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ:

> "عدل، انصاف کی بنیاد ہے اور انصاف، علم کا ہم نشیں۔ جو انصاف نہ کرے، وہ عدل نہیں کر سکتا اور جو عدل سے محروم ہو، وہ حق تک نہیں پہنچ سکتا۔"

ہم اللہ تعالیٰ سے نیت کی اصلاح، علمِ نافع، راست اور درست بات کہنے کی توفیق، اس کے نبی ﷺ کی کامل پیروی اور ائمۂ ہدایت کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعادت مانگتے ہیں۔ بے شک وہی اس کا کارساز ہے اور اسی کو اس کی پوری قدرت حاصل ہے۔

---

۱ طبقات الحفاظ، ص ۵۲۰-۵۲۱.

۲ دیکھیے: کتاب نَقضُ دعوی انتِسابِ الأشاعِرةِ لأهلِ السُّنّةِ والجماعةِ.

مولانا امین احسن اصلاحی کی

مفسرین اور فقہا پر الزام تراشیاں اور ان کی حقیقت

پروفیسر محمد رفیق

علم ودانش کی دنیا بڑی وسیع ہے، نت نئی دنیائیں دریافت ہوتی رہتی ہیں۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو نئی چیز دریافت کرے دنیا کے سامنے پیش کرے اور اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ قدیم نظریات پر تنقید کرے۔ البتہ اس حوالے سے ایک بات ذہن میں رہے کہ سائنسی دریافتوں اور دینی علوم میں ایک واضح فرق ہے۔ سائنس کا میدان انسانی تجربات کا میدان ہے، ممکن ہے کہ کوئی سائنس کا ماہر اور تجربہ کار علم کے سمندر میں دوسروں سے زیادہ گہرائی میں غوطہ زن ہو اور پہلوں سے مختلف چیز نکال لائے یا جو قدیم نظریات کو غلط ثابت کردے۔ لیکن دینی علوم کا منبع قرآن وسنت ہے، کوئی نیا منبع ایجاد کیا جاسکتا ہے نہ قرآن وسنت میں وارد کسی چیز کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ انسان کی تمام تر علمی تگ ودو قرآن وسنت کی حدود میں رہے گی۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی غامق جوہری کوئی گوہر نایاب ڈھونڈ لائے، کوئی نکتہ ور نیا نکتہ پیش کردے، کوئی کھوجی دور کی کوڑی کھوج لائے جس سے پہلے لوگ ناواقف ہوں، لیکن ایسا ممکن نہیں کہ چودہ سوسالہ تاریخ میں صحابہ کرام سے لے کر آج تک کروڑوں علماء کرام میں سے کسی ایک نے بھی قرآن مجید کی آیت یا کسی حدیث رسول کا درست مفہوم سمجھا ہی نہیں ہو۔ کوئی شخص اٹھے اور نعرہ لگادے کہ مجھ سے پہلے سب جاہل تھے، قرآن وسنت کو درست طریقے سے سمجھنے کی مجھ سے پہلے کسی میں صلاحیت ہی نہ تھی۔

متجددین اور منکرین حدیث کا یہی طریقہ واردات اور انداز تکلم ہے وہ اپنے سے پہلے تفہیم دین پر زندگیاں کھپانے والے تمام علماء کرام کو یک قلم غلط اور گنوار قرار دے دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ امت سے الگ تھلگ نظریات کو پیش نہیں کرسکتے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے مبلغ علم کا حال آپ گذشتہ شمارے میں دیکھ چکے ہیں، اس کے علی الرغم انہوں نے امت کے مفسرین کرام کے بارے میں متجددین اور منکرین حدیث کی طرح اپنی جن "علمی اور قیمتی" آراء کا اظہار کیا ہے، انہیں بھی ملاحظہ فرمایئے:

① سورۃ المؤمن (۴۰/۵۱) کی آیت

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [المؤمن: ۵۱]

"بے شک ہم مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی اور اس دن بھی بھی مدد کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔"

کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین کرام کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ

"اس آیت کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے، اس لیے کہ اس میں نہایت صراحت کے ساتھ اس بات کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے۔ اس الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے وہ فرق واضح طور پر نہیں ہے جو رسول اور نبی کے درمیان ہے[1]۔"

② سورۃ مریم (۱۹/۷۱) کی آیت:

﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱]

"اور تم میں سے کوئی نہیں جس کا دوزخ پر سے گزر نہ ہو۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے طے شدہ بات ہے۔"

کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"آیت کی یہ تاویل بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس کا مخاطب تمام بنی نوع انسان کو مان لیا ہے، چنانچہ وہ ہر شخص کے لیے، خواہ نیک ہو یا بد، جہنم سے گزرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ بس اتنی خیریت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنم پر پل صراط کے نام سے ایک پل ہو گا جس پر سے نیک لوگ تو گزر جائیں گے، البتہ وہ لوگ جہنم میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے جو برے ہوں گے۔ یہ غلط فہمی مفسرین کو صرف اسلوبِ کلام کے نہ سمجھنے کے سبب سے ہوئی ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ ان کی اکثر لغزشیں اسی چیز کا نتیجہ ہیں۔"

③ سورۃ الصافات (۳۷/۲۸) کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ:

"﴿تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ﴾ کے ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔

---

۱ تدبر قرآن: ۷/۴۹

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اسلوبِ کلام کی اس ندرت کو نہیں سمجھ سکے جو یہاں ملحوظ ہے[1]۔"

④ سورۃ الاحزاب (۳۳/ ۴۹-۵۲) کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس مجموعۂ آیات (۴۹-۵۲) کے پس منظر کو بھی اچھی طرح ذہن نشیں کر لیجئے کہ اس میں بھی بڑا ایجاز ہے جس کے سبب سے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے[2]۔"

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب تدبر قرآن جملہ مفسرین کرام کے بارے میں درج ذیل آراء رکھتے ہیں:

① ان حضرات کو نبی اور رسول کا فرق معلوم نہیں۔

② یہ حضرات عربیت کے اسلوبِ کلام اور اس کی ندرت کو نہیں سمجھتے۔

③ یہ حضرات قرآن کے اسلوب "ایجاز" سے ناواقف ہیں۔

اب ہم ان کی ان آراء کا علمی جائزہ لیں گے:

صاحب تدبر قرآن کی رائے میں نبی اور رسول کے درمیان یہ فرق ہے کہ کوئی نبی تو کسی وقت قتل ہو سکتا ہے مگر کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ مگر مفسرین کے نزدیک نبی اور رسول میں اس طرح کا کوئی فرق نہیں ہوتا، بلکہ وہ قرآن کے نصوص کی بنیاد پر یہ مانتے ہیں کہ یہود نے بعض رسولوں کو قتل بھی کیا تھا جیسا کہ سورۃ البقرۃ (۲/ ۸۷)، سورۃ آل عمران (۳/ ۱۸۳) اور سورۃ المائدۃ (۵/ ۷۰) سے ثابت ہے۔ ہم اس مسئلے پر اسے پہلے "تفسیر کی غلطیاں" کے عنوان کے تحت تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

جہاں تک ان کی اس الزام تراشی کا تعلق ہے کہ جملہ مفسرین نہ تو عربیت کے اسلوب کلام ہی سے واقف تھے اور نہ قرآن کے اسلوب ایجاز سے، تو اس بارے میں ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اب امتِ مسلمہ کے فقہاء کرام کے بارے میں بھی صاحب تدبر قرآن کی "گوہر افشانیاں" اس سے پہلے "تفسیر کی غلطیاں" کے عنوان کے تحت ہم نے صاحب تدبر قرآن کی کی بعض غلطیوں کی نشاندھی کرتے ہوئے ان کی اس غلطی بلکہ گمراہی کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے جو وہ شادی شدہ زانی کے لے حدِ رجم کی شرعی سزا کو نہیں مانتے۔

---

۱ تدبر قرآن: ۶/ ۳۶۳

۲ تدبر قرآن: ۶/ ۲۳۸

لیکن تعجب ہے کہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے سورۃ النور (۲۴/ ۲) کی تفسیر کے تحت تمام فقہاء اسلام کی متفقہ رائے اور اجماع کو بھی غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مجرم کی حالتوں میں سے ایک حالت کو مناطِ حکم قرار دے دیا، درآں حالیکہ اس کا تعلق مناطِ حکم سے نہیں ہے، اس طرح کی چیزیں تو ہر جرم کی سزا نافذ کرتے وقت ملحوظ رکھی جاتی ہیں[1]۔“

اور اسی مسئلے پر بحث کے دوران میں امتِ مسلمہ کے تمام فقہا کی اخلاقیات کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:

”ہمارے فقہا میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ جب وہ اپنے حریف سے مناظرہ پر آتے ہیں تو جو اینٹ پتھر انہیں ہاتھ آجائے وہ اس کے سر پر دے مارتے ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی زد خود دین پر کہاں تک پڑتی ہے[2]۔“

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسا آدمی امت کے جملہ مفسرین کرام اور تمام فقہائے عظام کے خلاف زبان درازی کرتا ہے جس کے اپنے مبلغ علم کا حال یہ ہے کہ

① اسے لقب اور کنیت کا فرق معلوم نہیں[3]۔
② جو ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ وہ ابلیس مر چکا ہے جس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا[4]۔
③ جسے بُعد المشرقین (مشرق و مغرب کی دوری) کے معنی معلوم نہیں[5]۔
④ جو فرشتوں کو بھی انسانوں اور جنات کی طرح شرعی طور پر مکلف سمجھتا ہے[6]۔
⑤ جسے یہ علم نہیں کہ قرآن کی ایک سے زیادہ (سبعہ یا عشرہ) متواتر قراءتیں ہیں[7]۔
⑥ جو قرآن کے حروف مقطعات کو ان سورتوں کے نام قرار دیتا ہے جن کے شروع میں وہ وارد ہوئے ہیں

١　تدبر قرآن: ۵/ ۳۷۴
٢　تدبر قرآن: ۵/ ۳۶۷
٣　تدبر قرآن: ۹/ ۶۳۲
٤　تدبر قرآن: ۹/ ۶۷۷
٥　تدبر قرآن: ۷/ ۲۲۲-۲۲۳
٦　تدبر قرآن: ۱/ ۱۶۴-۱۶۵
٧　تدبر قرآن: ۵/ ۹۹-۸/ ۸،۷

اور اس طرح وہ "الم" کو سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم کا ایک ہی مشترکہ نام قرار دیتا ہے[1]۔

⑦ جو سورۃ الاخلاص کی فضیلت میں وارد صحیح حدیث کہ یہ سورۃ ثلث قرآن کے برابر ہے کو "عارفوں کا قول" سمجھتا ہے[2]۔

⑧ جو قرآنی آیات کے فواصل (آخری ہم آہنگ الفاظ) کو شاعری کے قافیے قرار دیتا ہے[3]۔

⑨ جسے یہ تک معلوم نہیں کہ سورۃ الفاتحہ سات آیات پر مشتمل سورۃ ہے[4]۔

⑩ جو احادیث قدسیہ سمیت سینکڑوں احادیث صحیحہ کا منکر ہے اور شادی شدہ زانی کے لیے سنت اور اجماع سے ثابت حد رجم کا انکاری ہے[5]۔

⑪ جسے اصول فقہ کی اصطلاح "اجماع" کی صحیح تعریف تک معلوم نہیں[6]۔

⑫ جسے "ید" (ہاتھ) اور "اید" (طاقت و قدرت) جیسے الفاظ کے معنیٰ کا فرق معلوم نہیں[7]۔

⑬ جو یہ نہیں جانتا کہ صحیح حدیث کی رو سے گناہ گار مسلمان جہنم میں اپنی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل ہوں گے[8]۔

⑭ جو قرآن میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو تسلیم نہیں کرتا اور ان کی غلط تاویلیں کرتا ہے[9]۔

ایسے شخص کو کیونکر یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ امت مسلمہ کے محترم اکابر مفسرین اور فقہائے کرام کے خلاف زبان درازی کرے، ان کے فہم و بصیرت پر طعن کرے، ان کی اخلاقیات پر عیب لگائے اور دین میں انہیں ساقط الاعتبار ٹھہرائے؟

---

١ تدبر قرآن: ١/ ٨٣، ٨١- ٢/ ٩- ٤/ ١٨٨
٢ تدبر قرآن: ٩/ ٦٣٩
٣ تدبر قرآن: ٦/ ٣٨٨- ٩/ ٥١٥
٤ تدبر قرآن: ٤/ ٧٧، ٣٧٦
٥ تدبر قرآن: ٧/ ٩١- ٥/ ٣٧٤
٦ تدبر قرآن: ٢/ ٣٢٥
٧ تدبر قرآن: ٧/ ٦٢٦
٨ تدبر قرآن: ٢/ ٣٦١
٩ تدبر قرآن: ٥/ ٧١

ایاز قدر خود بشناس!

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ "تفسیر تدبر قرآن" بنیادی طور پر ایک بدعی، باہم متناقص اور متنازعہ تفسیر ہے جس کے مصنف نے ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے مذموم کا ارتکاب کیا ہے۔

اس موقع پر اصلاحی صاحب کے متعلق دوسرے علماء کی آرا بھی لی جائیں:

① اصلاحی صاحب کے ایک ہمدرد ناقد اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے سابق رکن اور مرکزی رہنما و امیر مولانا گوہر رحمن مرحوم نے ان کے اور ان کے استاذ مولانا فراہی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مولانا فراہی اور ان کے ترجمان مولانا اصلاحی عربیت کے ماہر تھے اور عربی لغات پر ان کو عبور حاصل تھا لیکن احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہ و تابعین اور امت مسلمہ کے ہزاروں محدثین، مفسرین اور فقہا کے تدبر و تفقہ کو نظر انداز کر کے، یا ان پر صرف ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر خالص اپنی عربی دانی کی بنیاد پر تفسیر کرنا اور اسلاف کے تدبر کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے اور اپنے شیخ کے تدبر پر اعتماد کرنا بہت بڑی خود اعتمادی اور بے احتیاطی ہے جو کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے[1]۔"

② پروفیسر ڈاکٹر ابوہشام محمد ادریس اپنی کتاب "قرآن کریم اور اس کے چند مباحث" میں تفہیم تدبر قرآن کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تدبر قرآن: مولانا امین احسن اصلاحی اس تفسیر کے مؤلف ہیں۔ آٹھ جلدوں کی یہ ایک ضخیم اردو تفسیر ہے۔ یہ تفسیر بہت عمدہ ہوتی اگر سلف صالحین کے منہج کے مطابق لکھی جاتی۔ اس لئے کہ مؤلف کا قلم اپنے مدعا کو بیان کرنے میں جاندار ہے۔ تفسیر میں قرآن کی تفسیر قرآنی آیات سے کی گئی ہے مگر استشہاد کے طور پر عربی محاورات، اشعار اور لغت کو زیادہ اہمیت دی ہے جب کہ ان عربی محاورات اور اشعار کے ماخذ کا علم تک نہیں ہوتا کہ کہاں سے مستفاد ہیں۔ حدیث رسول سے استشہاد پوری کتاب میں شاید دو چار مقامات میں ہو۔ حالانکہ صاحب کتاب کی سیرت اور زمانہ وحالات ذکر کئے بغیر کوئی بھی تفسیر گہنی سی ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی تفسیر کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے گو وہ جدید سہی مگر ان میں معتزلی خیالات کی بھرپور ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی تجدد کا رنگ یا نتیجہ ہے کہ

---

1 علوم القرآن: ۲/ ۶۴۶، ناشر مکتبہ تفہیم القرآن، مردان

تفسیر میں نصوص سے استدلال کی کمی اور عقلی ترجیح نمایاں نظر آتی ہے۔ نظم قرآن، آیات و سور کا باہمی ربط تدبر قرآن کی جان ہیں اور بہترین وعمدہ انداز میں اس کو واضح کیا گیا ہے۔

مولانا نے بعض اجماعی مسائل کو اپنے فہم کے مطابق سخت کلامی کے ساتھ رد کیا اور متنازعہ بھی بنا دیا اور جو انداز گفتگو اس موقع پر اپنایا وہ مولانا جیسے پایہ کے عالم دین کو زیب نہیں دیتا۔ حروف سبعہ پر بھی مولانا کو خاصا اعتراض تھا، امام زہری جیسے بلند پایہ محدث و بہادر فقیہ سے مستشرقین کی طرح انہیں بھی کد تھی، رجم محصن جیسے اجتماعی مسئلے سے بھی کھلا اختلاف رکھتے تھے۔ احادیث رسول کو مشکوک بنانے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ مزاج کی سختی نے انہیں کسی بھی عالم، فقیہ، محدث، مفسر سے استفادہ یا ان کے ذکرِ خیر کی سبیل نہیں دکھائی۔ محض اپنی منفرد فکر کے عاشق تھے اور اس کے راہی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی اس تفسیر کے مثبت و منفی اثرات دونوں سے قاری کو آگاہ کرے۔ آمین[1]۔

(۳) مسلک اہل حدیث کے معروف عالم مولانا صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ اصلاحی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"اصلاحی صاحب دنیا سے جا چکے ہیں، اب ان سے کس نے بغض و عناد رکھا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ شروح بخاری (دو جلدیں) اور تفسیر تدبر قرآن (۹ جلدیں) کی صورت میں گمراہی کا بہت بڑا پلندہ چھوڑ گئے ہیں[2]۔"

"تدبر قرآن گمراہانہ افکار کی ایک شاہکار تفسیر ہے لیکن ابھی عام لوگوں سے یہ حقیقت مخفی ہے۔"

"ہمارے نزدیک وہ (اصلاحی صاحب) برصغیر پاک وہند کے خطرناک ترین منکر حدیث ہیں[3]۔"

سیدنا مسیح علیہ السلام کا مشہور فرمان ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اصلاحی صاحب کی فکر خبیثہ کے شجر سے جاوید غامدی، خالد ظہیر، خورشید ندیم اور عمار یاسر جیسے برگ و بار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے مقتدا و پیشوا کی گمراہیوں میں اضافے کر کے اسے ضلالتوں کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

---

۱ ابوہشام، قرآن کریم اور اس کے چند مباحث، ص ۲۸۱-۲۸۲

۲ مولانا امین احسن اصلاحی (اپنے حدیثی و تفسیری نظریات کی روشنی میں) ص ۴۶، المدینہ اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی

۳ ایضا، ص ۱۳۴

امین احسن اصلاحی: ایک متنازعہ مفسر

عبدالرحمن عزیز

نام کتاب	امین احسن اصلاحی: ایک متنازعہ مفسر (تعداد صفحات: ۳۲۰)
نام مصنف	پروفیسر محمد رفیق
ناشر	مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور (۰۳۲۱۷۷۲۴۰۳۲)

دین اسلام کا منبع وحی الٰہی ہے، رسول ﷺ کی ذمہ داری محض اس کا ابلاغ نہیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح یا الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد و منشا کو واضح کرنا ہے اور امت کی ذمہ داری اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ شریعت سازی کا اختیار ہرگز انہیں حاصل نہیں ہے۔

محدثین اور فقہا کی ساری کاوشیں شرعی نصوص کی تفہیم تک محدود تھیں، اس لیے انہوں نے ہمیشہ عقل و دانش کو نص کے تابع رکھ کر اس کی تفہیم کے لیے استعمال کیا۔ اس کے برعکس تاریخ میں ایسے لوگ بھی رہے ہیں جنہوں نے اپنی عقل کو اہمیت دی اور نصوص کو اپنی عقل کے تابع کرنے کی کوشش کی۔

وحی کی روشنی سے ہٹ کر کی گئی تفسیر کو "تفسیر بالرائے مذموم" کہا جاتا ہے۔ تمام گمراہ فرقوں نے یہی کام کیا۔ انھی میں سے ایک عبدالحمید (حمید الدین) فراہی بھی ہیں۔ انہوں نے حدیث رسول ﷺ کی بجائے عربی لغت اور شعراء جاہلیت کو معیار قرار دیا اور اسی اصول پر بعض سورتوں کی تفسیر لکھی۔ ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی نے انھی کے وضع کردہ اصولوں کی تقلید میں 'تدبر قرآن' کے نام سے ایک ضخیم تفسیر لکھی۔

جو شخص کلام اللہ کی تفہیم کے لیے نبی ﷺ کی تشریحات کو چھوڑ کر اپنی عقل کو معیار بنالے، اس کی تفسیر کے متعلق کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مراد و منشا پالیا ہے یا وہ شخص کیونکر غلطی سے بچ سکتا ہے؟ امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر بالرائے میں بے شمار غلطیاں کیں، فکری بھی، لغوی بھی اور ترجمہ و تفسیر کی بھی۔ بلکہ امت کی ساڑھے چودہ سو سال کی علمی تاریخ اور دینی روایت کو بزعم خود غلط قرار دے دیا۔

انھی کے ایک شاگرد پروفیسر مولانا محمد رفیق صاحب نے احقاق حق اور ابطال باطل کے پیش نظر "تدبر قرآن" پر محاکمہ تحریر کیا۔ وہ اپنے اور مولانا کے تعلق کے بارے میں صفحہ ۱۱-۱۲ پر تحریر کرتے ہیں:

"اصلاحی صاحب سے برسوں تک میرا تعلق رہا ہے۔ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے احباب کے ہمراہ ان کے اس درس قرآن میں بھی باقاعدہ شریک ہوتا رہا ہوں جو وہ کئی برس (۱۹۷۵ء-۱۹۷۳ء کے لگ بھگ) تک شیخوپورہ سے لاہور تشریف لاکر سمن آباد کی ایک کوٹھی میں وقتاً فوقتاً دیا کرتے تھے۔ میں نے ان دروس میں قرآن کے آخری دس پاروں کی پوری تفسیر ان کی زبانی سنی....

پھر جب وہ اپنی اہلیہ کی بیماری اور پھر ان کی وفات کے بعد دوبارہ لاہور منتقل ہو گئے تو اس زمانے میں بھی میرا اُن کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وہ مجھ پر شفقت فرماتے اور میں بھی ایک نیاز مند اور شاگرد کی طرح اُن کا احترام ملحوظ رکھتا۔ مگر اس دوران جب مسئلہ رجم پر میرا ان سے بحث و مباحثہ اور اختلاف ہو گیا اور میں نے اُن کے خلاف "حد رجم کے نام سے ایک کتاب لکھی تو وہ سخت ناراض ہو گئے اور اس کے بعد ہمارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے۔"

مضامین کو ۱۰ ابواب میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کی فہرست آپ کی ملاحظہ فرمائیں:

پہلا باب میں علوم القرآن سے متعلق اصلاحی صاحب کے متنازعہ بیانات کا تذکرہ ہے، قرآن مجید کی جمع و تدوین، قراءات قرآنیہ، سورتوں کے مکی، مدنی اور سورۃ اللہب کے مکی یا مدنی ہونے کے حوالے سے مولانا اصلاحی کا موقف امت کے مجموعی موقف سے ہٹا ہوا ہے۔

دوسرے باب میں "تدبر قرآن" کے اصول تفسیر کا ذکر ہے کہ اصلاحی صاحب احادیث و آثار کی بجائے خود ساختہ نظم قرآن، قدیم آسمانی صحیفے اور تاریخ عرب کو تفسیر کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

تیسرے بات میں "تدبر قرآن" کے ترجمہ قرآن کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں تدبر قرآن میں تفسیر کی غلطیاں واضح کی ہیں۔ پانچویں بات میں اصلاحی صاحب کے حدیث سے اعراض و گریز پر بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں ان کے انکار حدیث پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتویں باب میں ان مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں اصلاحی صاحب نے اجماع امت کی مخالفت یا انکار کیا ہے۔

آٹھویں باب میں اصلاحی صاحب کے انکار معجزات، نوویں باب میں فکری تضادات کی فہرست گنوائی ہے، مزید یہ بتایا گیا ہے کہ اصلاحی صاحب اپنے نظریات کی ترویج کے لیے دینی اصطلاحات کے معانی بدلتے ہیں۔

دسویں اور آخری باب میں اصلاحی صاحب کے مبلغ علم کا تار پود بکھیرا ہے۔

ہر صاحب علم کو اس کتاب کا لازماً مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے صحیح اصولوں میں اور اس کے غلط طریقوں میں فرق کو بھی اچھی طرح سمجھا جاسکے۔

شیخ الحدیث مولانا فاروق احمد راشدی

عالمانہ سادگی، وفا اور استقامت کی موت

ڈاکٹر فہد اللہ مراد

دس محرم ۱۴۴۸ھ کی شب لاہور سے بہ ذریعہ ٹرین ایک سفر پر نکلنا تھا کہ افطار کے وقت ایک حادثے کی خبر موصول ہوئی کہ جس نے ہمارے تمام تر معمولات کو تہہ وبالا کر دیا وہ یہ کہ بقیۃ الاولیاء، زبدۃ العلماء، نمونۂ سلف حضرت شیخ الحدیث مولانا فاروق احمد راشدی اس الم ناک دن میں مرحومین کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ آپ کی وفات حسرت آیات پر ہم وفا، سادگی اور استقامت کا نوحہ پڑھیں گے۔

مولانا فاروق احمد راشدی کا اسم گرامی ان قابل تقلید ہستیوں میں شمار ہوتا ہے جن کا ذکر خیر ہمارے گھر کے مستقل معمولات میں شامل تھا۔ والد گرامی امام القرا حضرت قاری محمد یحییٰ رسول نگریؒ کا مبارک معمول تھا کہ اسلاف کے تذکرے سے اپنی مجالس کو آباد رکھتے اور اپنے آنسوؤں سے انھیں خراج تحسین پیش کرتے رہتے تھے۔ جن میں حضرت مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، میاں محمد باقر، قاری اظہار احمد تھانوی، پیر جماعت علی شاہ، مولانا احمد علی لاہوری، علامہ محمد یوسف کلکتوی، مولانا ابو البرکات احمد مدراسی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا محی الدین لکھوی، مولانا حافظ عبد الرزاق، مولانا قاری فاروق احمد، مولانا محمد صدیق کرپالوی جیسی نادرۂ روزگار ہستیاں شامل تھیں۔

زندہ علما میں حضرت جن شیوخ کا بہ کثرت تذکرہ کرتے اور ان سے گاہے گاہے سلسلۂ ملاقات بھی رہتا، ان میں مولانا راشدیؒ بھی تھے۔ مولانا راشدیؒ سے آپ کا تعلق تلمذ کا تھا۔ مسجد چینیانوالی سے تجوید و قراءت سے فراغت کے بعد آپ درس نظامی کے لیے جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ تشریف لے گئے، جہاں ابتدائی تین سال تک تعلیم حاصل کی؛ وہیں مولانا راشدیؒ سے شرفِ تلمذ پایا۔ اس واقعہ کے بعد ہم نے حضرت والد گرامی کو ہمیشہ مولانا راشدی کے بارے رطب اللسان پایا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی شخصیت عالمانہ سادگی کے باوصف ہمیشہ ہمارا گھریلو رومان رہی ہے۔

مولانا کی طبیعت میں سادگی کا وہ عنصر جسے ہم نے عنوان بنایا ہے، وہ تو ہر اس شخص پر آشکار ہو جاتا تھا جسے حضرت کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ عام طور پر سادہ جالی دار ٹوپی پہنے ہوئے کھلے سادہ لباس میں ملبوس، وقار

میں گندھے ہوئے، ہر قسم کی تصنع سے پاک نظروں کو خیرہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بندہ نوازی اس سطح کی تھی کہ جب احقر ایک دفعہ والد گرامی کے ہم راہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں ادارۂ محدث لاہور سے وابستہ تھا اور رشد قراءت نمبر نئے نئے جاری ہوئے تھے۔ والد صاحب نے میرے بارے میں فرمایا کہ لاہور حضرت مدنی شفاہ اللہ کے پاس ہوتا ہے؛ تو آپ فرمانے لگے: میں نے فہد اللہ کے مضمون دیکھ رکھے ہیں؛ ساتھ ناصحانہ ارشاد فرمایا کہ آپ کی نثر تھوڑی مشکل ہے، اُسے آسان کرو۔

ہمارے لیے اس سے بڑا کیا اعزاز تھا کہ وہ شخصیت جو والد گرامی کے اُستاد ہیں، ہمارے الفاظ کو بھی زیر نظر رکھتے ہیں۔

وفا آپ کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی ایک قابل رشک مثال یہ ہے کہ زندگی بھر اپنے اُستاد گرامی حضرت مولانا ابوالبرکات احمدؒ کے ارشاد کے مطابق ان کی مسند کے نہ صرف امین رہے بل کہ ہر طرح کے مصائب و آلام میں ثابت قدم رہے؛ حتیٰ کہ حضرت استاد گرامی کی ذاتِ مبارک اور مدرسے کی انتظامیہ میں سے کسی ایک کو انتخاب کا موقع ملتا تو ہمیشہ قرعہ ٔ انتخاب استاد گرامی کے نام آتا۔ اس پر ایک واقعہ شاہد عدل ہے کہ حضرت مولانا ابوالبرکاتؒ کے فرزند ارجمند مولانا عبدالسمیع عاصم بھی حضرت راشدی کے زیر سایہ جامعہ اسلامیہ میں پڑھاتے تھے۔

ایک موقع پر مولانا عبدالسمیع کے انتظامیہ کے ساتھ تعلقات میں دراڑ آگئی جس پر انھوں نے ان کی خدمات واپس کر دیں۔ حضرت راشدیؒ کا تعلق مولانا عاصم سے ایک استاد ادارہ کا نہیں تھا بل کہ وہ ان میں اپنے نادرۂ روزگار استاد کا عکس دیکھتے تھے۔ حضرت راشدیؒ نے اس اختلاف کو رفع کروانے کی بہت کوشش کی اور بتایا کہ یہ کوئی استاد نہیں بل کہ مولانا کے فرزند ہیں لیکن انتظامیہ اپنی رائے پر جمی رہی؛ بالآخر مولانا نے اپنا آخری فیصلہ سنایا کہ استاد گرامی کے بیٹے کے ہم راہ ان کا شاگرد بھی رختِ سفر باندھے گا۔

دوستانہ وفا کا عالم یہ تھا کہ مولانا محمد علی جانباز صاحبِ انجاز الحاجہ شرح ابن ماجہ آپ کے ہم درس تھے۔ زندگی بھر ان سے دوستی کا تعلق اس شدت سے نبھایا کہ ایک مثال بن گئی۔ ان کے صحت کے دنوں مہینے میں دو بار ملاقات کا سلسلہ قائم رہا لیکن جب مولانا جانباز علیل ہو گئے تو ہر ہفتے انھیں دیکھنے جاتے اور گھنٹوں بیٹھ کر دوستانہ یادوں کو تازہ کر کے بیماری اور نقاہت کے بوجھ کو ہلکا کرتے۔

استقامت کا عالم یہ تھا کہ پینسٹھ برس کی اپنی تدریسی ذمہ داری کے آخری روز بھی اپنے اسباق پڑھائے اور پھر حکومتی شیڈول پر نو دس محرم کی جامعہ میں عمومی تعطیل ہو گئی۔ اگلے روز کچھ علالت کا صدمہ برداشت کیا اور

دس محرم کو بارگاہِ ایزدی میں بندۂ وفاشعار کے طور پر حاضر ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وأسکنہ فسیح جنانہ

آپ کی اسی عملی استقامت کا نتیجہ ہے کہ جماعت کے کبار اعلام جو کہ خود اپنی زندگی میں ایک بزم تھے، نے آپ سے زانوے تلمذ طے کیے اور آپ کی دعاؤں سے بزم علم وہنر کے آفتاب بنے جن میں سر فہرست حضرت والد گرامی امام القراء قاری محمد یحییٰ رسول نگری، حضرت شیخ المجودین والمقرئین قاری محمد ادریس عاصم لاہوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اعظم گوجرانوالہ، الشیخ مولانا ثناء اللہ زاہدی، مولانا ڈاکٹر عبد الرشید اظہر اور مولانا حفیظ الرحمن لکھوی ایسے اصحاب علم وفضل شامل ہیں۔

استقامت اور ذمہ دارانہ تدریس کا یہ عالم تھا کہ تدریس میں ناغے سے نفرت کی حد تک بیر تھا اور اگر کسی استاد اور طالب کے بارے معلوم ہوتا کہ وہ ناغہ نہیں کرتا تو اسے انعام سے نوازتے اور خوب حوصلہ افزائی کرتے۔ ایک مرتبہ جامعہ اسلامیہ کے استاد اور حضرت مولانا ابو البرکات کے لخت جگر مولانا عبد السمیع عاصم نے جامعہ اسلامیہ میں تقریب بخاری کے دوران یہ اعلان کر دیا کہ جامعہ میں کوئی ایسا طالب علم ہو جس نے سبق کا ناغہ نہیں کیا تو اُسے انعام سے نوازا جائے گا۔ ساتھ یہ بھی خبر دی کہ الحمدللہ آپ کے اساتذہ میں چھے مبارک ہستیاں ایسی ہیں کہ جنھوں نے سال بھر سبق میں ایک ناغہ بھی نہیں کیا! حضرت راشدیؒ نے جب اپنے اساتذہ کی اس ذمہ دارانہ روش کے بارے میں بر سر مجلس یہ اعلان سنا تو فرطِ جذبات سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور چھے کے چھے اساتذہ کی خدمت میں انعامی رقم پیش فرمائی۔

جامعہ اسلامیہ میں معلمانہ ذمہ داری کا یہ ولولہ حضرت والد گرامی کے بہ قول مولانا ابو البرکات کی ذات باکمال سے پیدا ہوا تھا۔ آپ اپنے دورِ نظامت میں اس قدر ہمہ جہت منتظم اور معلم تھے کہ آج اس کی پابندی تو در کنار سوچنا بھی محال ہے۔ آپ نے بے پناہ تدریسی مصروفیات کے ساتھ جامعہ کی جملہ انتظامی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال رکھا تھا؛ مثلاً وہ طلبہ کا داخلہ خود کرتے، اسمبلی کا اہتمام اور طلبہ کی حاضری خود لگاتے۔ رات کو بھی طلبہ کی حاضری کا اہتمام کرتے۔ مطالعہ میں بھی طلبہ کی نگرانی فرماتے۔ یہاں تک جامعہ کی لائبریری کی ذمہ داری بھی خود پر ڈال رکھی تھی؛ کتابوں کا اجرا اور انھیں جمع بھی خود فرماتے۔ یہ وہ اوصافِ حمیدہ ہیں جو مولانا راشدیؒ کو اپنے شفیق مربی سے ملے تھے جنھیں زندگی بھر اسی طرح کامل قلندرانہ شان سے نبھاتے رہے۔ مولانا راشدی نے شانِ استغنا بھی اپنے شیخ سے وراثت میں پائی تھی آپ تدریسی ذمہ داریوں کے بعد عصر کے وقت ایک مطب پر بھی بیٹھتے تھے اور خانگی ذمہ داریوں کے لیے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہی روش حضرت مولانا ابو البرکات کی تھی کہ اپنے ذاتی کاموں میں طلبہ تک کو زحمت دینا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ دینی تعلیم سے وابستہ اکثر افراد فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور قوت لایموت ہی ان کا روزگار ہوتا

ہے۔ اس سے دیگر اشواق دینی و دنیوی کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا بہت سارے علما شوق کے باوصف حج مبارک تک کا سفر نہیں کر پاتے۔ ایک دفعہ مولانا ابوالبرکات کے ایک عقیدت مند نے حج کے خرچ کے لیے جو کچھ سرمایۂ ضرورت تھا، سب خدمت میں پیش کر کے عرض کی کہ آپ حج فرمالیں۔ آپ نے یہ کہہ کر وہ رقم واپس کر دی کہ حج زادِ راہ کی شرط پر فرض ہے کیوں میرے پاس اس قدر مال ہی نہیں ہے، اس لیے مجھ سے یہ فرض ہی ساقط ہے؛ آپ اپنا مال اپنی ضروریات میں استعمال فرمالیں۔ یہ وہ قلندرانہ شان ہے کہ فقیروں کے حضور شاہوں کا بھی گزر نہیں ہونے دیتا۔ ہمیں بھی مالک ارض و سما انھی اخلاق حمیدہ کا پیکر بنادے۔ آمین!

شاید یہی وہ عالمان باصفا تھے جن کے بارے میں شورش مرحوم نے کہا تھا:

زیادہ دن نہیں گزرے یہاں کچھ لوگ رہتے تھے
جو دل محسوس کرتا تھا علی الاعلان کہتے تھے
گریباں چاک دیوانوں میں ہوتا تھا شمار ان کا
قضا سے کھیلتے تھے وقت کے الزام سہتے تھے

آپ کے سوگواران میں ہر صاحب علم اور طالب دین شامل ہے لیکن خاندان میں آپ نے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑی ہیں۔

بڑے صاحب زادے جناب عبدالسمیع صاحب وفاقی دارالحکومت میں ایک محکمہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ منجھلے جناب مولانا عبدالباسط صاحب سرکاری تعلیمی ادارے میں خدمات کے ساتھ ساتھ جامعہ اسلامیہ میں بھی وقت دیتے ہیں۔ درمیانے صاحب زادے جناب مولانا عبدالماجد کلیم آپ کے علمی وارث ہیں اور آپ کے زیر سایہ درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخری دونوں بیٹے جناب عبدالاحد اور جناب عبدالواجد میڈیسن کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ عبدالواحد صاحب حاذق طبیب ہیں اور والد گرامی کی مستند طبابت کے امین ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر سب سوگواران کو صبر و جمیل عنایت فرمائے اور مولانا گرامی کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔

علمائے ربانیین جو کہ کسی سیاسی یا قومی منصب پر نہ ہوں، ان کا پہلا استقبال جنازے کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہم احباب کے ہم راہ جب گیارہ محرم بہ روز ہفتہ کو گوجرانوالہ مکرم مسجد پہنچے تو دیکھا پورے ملک کے طول و عرض کے علمائے کرام، قرائے عظام اور طلبائے علوم نبوت کے قافلے جوق در جوق پہنچ رہے ہیں۔ پورے مرکز میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی حسب وصیت مولانا حافظ عبدالماجد کلیم صاحب نے امامت کروائی اور ہزاروں شائقین علم کے آنسوؤں اور پر کیف دعاؤں کی چھاؤں میں آپ کو اپنے اساتذہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا؛ اللھم اغفرله وارحمه وارفع درجته فی علیین۔

لسانِ قرآن کا پاسبان ڈاکٹر مازن المبارک

ڈاکٹر حافظ ابو عمرو

دمشق کی علمی فضا نے گذشتہ صدی میں عربی زبان و ادب کے جن رجال کو پروان چڑھایا، ڈاکٹر مازن عبدالقادر المبارک ان میں ایک ممتاز اور صاحبِ امتیاز شخصیت تھے۔ تقریباً ایک صدی پر محیط زندگی گزار کر ۲۵ جولائی ۲۰۲۶ء کو دمشق میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو عربی زبان نے اپنے ان قدیم پاسبانوں میں سے ایک کو کھو دیا جن کے نزدیک زبان محض اظہار و ابلاغ کا وسیلہ نہ تھی بل کہ ایک امت کی تہذیبی یادداشت، اس کی فکری شناخت اور اس کے دینی شعور کی امین تھی۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس، تحقیق و تصنیف، احیاے تراث اور عربی زبان کے مقام و مستقبل کی حفاظت میں بسر ہوا۔

۱۹۳۰ء میں دمشق کے قدیم محلے العمارۃ کے ایک علمی و دینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد شیخ عبد القادر المبارک شام کے نام ور اہلِ زبان میں شمار ہوتے تھے اور بڑے بھائی ڈاکٹر محمد المبارک زبان، شریعت اور اسلامی فکر کے ممتاز عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم سے جامعہ تک دمشق ہی میں رہے اور سعید الافغانی، مصطفیٰ زرقا، محمد بہجت البیطار، امجد الطرابلسی اور شفیق جبری ایسے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ دمشق کے کلیۂ آداب اور کلیۂ تربیت، دونوں کے فارغ التحصیل طلبہ میں اوّل رہے۔ پھر قاہرہ یونی ورسٹی گئے جہاں زجاجی کی الإیضاح في علل النحو پر تحقیق کے ساتھ ایم اے اور الرماني النحوي في ضوء شرحه لكتاب سيبويه کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ واپسی پر جامعہ دمشق سے وابستہ ہوئے اور بالآخر علومِ زبانِ عربی کے پروفیسر کے منصب تک پہنچے۔

ان کے علمی کام کی وسعت کا اندازہ ان کی تصانیف ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ الزجاجي: حیاته وآثاره ومذهبه النحوي، الرماني النحوي، النحو العربي، الموجز في تاريخ البلاغة، بحث في تاريخ النحو والعلة النحوية، نظرات وآراء في اللغة وعلومها، نحويون قدماء ومحدثون اور البديع بين ابن المعتز وقدامة ان کی تخصصی دل چسپیوں کی نمایندگی کرتی ہیں۔ تحقیق تراث کے میدان میں زجاجی کی الإيضاح في علل النحو اور كتاب اللامات، ابن ہشام کی مغني اللبيب اور

المباحث المرضية اور ابن جنی کے بعض رسائل کی تحقیق ان کی علمی یادگاروں میں شامل ہے۔ ان کے نزدیک تراث کی خدمت ماضی کی پرستش نہیں بل کہ علمی روایت سے زندہ تعلق قائم رکھنے کا ذریعہ تھی۔

تاہم ان کی شخصیت کو محض ایک نحوی، محقق یا مؤرخِ بلاغت سمجھنا ان کے علمی کام کا پورا تعارف نہیں۔ ان کی نمائندہ کتاب نحو وعي لغوي ان کے لسانی فکر کی اصل کلید ہے۔ ان کے نزدیک زبان کسی قوم کی وحدت کی بنیاد اور اس کی تہذیب کا آئینہ ہوتی ہے اور عربی کا معاملہ اس لیے غیر معمولی ہے کہ یہ قرآن کی زبان بھی ہے۔ قرآن نے عربی کو صرف دوام نہیں بخشا بل کہ اسے وہ مقام عطا کیا جہاں زبان، عقیدہ، تہذیب اور تاریخی شعور ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ عربی کی کم زوری کو صرف ایک لسانی حادثہ نہیں سمجھتے تھے؛ ان کے نزدیک اس کے اثرات امت کی فکری خود آگہی اور تہذیبی شناخت تک پہنچتے ہیں۔

اسی زاویہ نظر سے وہ عربی کے مقابل عامیانہ بولیوں اور لہجوں کی بالادستی، عربی رسم الخط کو لاطینی حروف سے بدلنے، زبان کو جدید علوم کے اظہار سے عاجز قرار دینے اور اصلاح و تجدید کے نام پر اس کی بنیادی ساخت سے بے اعتنائی کی تحریکوں کو محض فنی اختلاف نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ سیاسی استعمار کے بعد فکری استعمار زبان اور تعلیم کے راستے سے قوموں کے شعور میں جگہ بنا لیتا ہے۔ البتہ وہ ہر تجدید کے مخالف نہ تھے؛ تدریسِ نحو کی آسانی، غیر عربوں کو عربی سکھانے، تعریب، اعلیٰ تعلیم اور علمی تحقیق میں عربی کے مؤثر استعمال جیسے موضوعات خود ان کی مستقل علمی دل چسپیوں میں شامل تھے۔ وہ جمود نہیں، ایسی تجدید کے خواہاں تھے جو زبان کو زندہ بھی رکھے اور اس کی صحت و اصالت کو بھی محفوظ رکھے۔ مجمع ملك سلمان عالمي للغة العربية نے ۲۰۲۵ء میں انھیں "نشر الوعي اللغوي" کے شعبے کا انعام دیتے ہوئے بجا طور پر نحو وعي لغوي کو ان کے اس علمی منصوبے کا نمایاں مظہر قرار دیا۔ لغويات قرآنية اور وهذا لسان عربي مبين جیسی کتابیں، سورۂ ناس پر ان کا لغوی مطالعہ اور دمشق کے عظیم محدث شیخ بدر الدین حسنی پر ان کی کتاب المحدّث الأكبر الشيخ بدر الدين الحسني بتاتی ہیں کہ ان کے ہاں زبان کا رشتہ قرآن، دینی روایت اور شام کی علمی میراث سے کٹا ہوا نہ تھا۔ وہ اصلاً فقیہ یا محدث نہیں، ایک لغوی و ادیب تھے لیکن ایسے لغوی جن کے نزدیک عربی کی پاسبانی بالآخر لسانِ قرآن اور اسلامی علمی تراث کی پاسبانی سے جا ملتی تھی۔

ان کی خدمات کتابوں تک محدود نہ تھیں۔ وہ جامعہ دمشق میں غیر عربوں کو عربی سکھانے کے ادارے کے پہلے مدیر رہے؛ ریاض، لبنان، قطر، وهران اور دبئی کی جامعات میں تدریس کی؛ مجمع اللغة العربية دمشق کی متعدد علمی کمیٹیوں کی سربراہی کی اور اس کے مجلے میں دہائیوں تک لکھتے رہے۔ ان کی زندگی میں درس گاہ،

کتاب، مجمع اور علمی مجلس ایک ہی مقصد کی مختلف صورتیں بن گئے تھے: عربی زبان کو اس کی علمی صلاحیت، تہذیبی وقار اور قرآنی نسبت کے ساتھ زندہ رکھنا۔

ڈاکٹر مازن المبارک رخصت ہو گئے لیکن جس سوال کے ساتھ انھوں نے عمر گزاری، وہ بہ دستور ہمارے سامنے ہے: کیا عربی اپنے ہی اہلِ زبان کی درس گاہ، تحقیق، فکر اور اجتماعی زندگی میں وہ مقام پھر حاصل کر سکے گی جس کی وہ سزاوار ہے؟ ان کی علمی میراث اس سوال کا جواب بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک دعوت بھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کی علمی کاوشوں کو صدقۂ جاریہ بنائے اور لسانِ قرآن کی خدمت کو ان کے میزانِ حسنات میں قبول فرمائے؛ آمین۔

اکابرِ اہلِ حدیث کی ایک یادگار؛ مولانا ابو بکر صدیق سلفی رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر کی جماعت اہلِ حدیث کی علمی تاریخ میں ایک نسل وہ تھی جس نے تقسیمِ ہند سے پہلے کے نام ور اساتذہ و شیوخ سے بہ راہِ راست اکتسابِ علم کیا، قیامِ پاکستان کے ہنگامہ خیز دور کو دیکھا، نئے ملک میں دینی مدارس اور جماعتی اداروں کی تشکیل و استحکام میں حصہ لیا اور پھر کئی دہائیوں تک درس و تدریس، دعوت و تبلیغ اور جماعتی خدمت میں مصروف رہی۔ مولانا ابو بکر صدیق سلفی رحمہ اللہ اسی نسل کے نمایندے تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ کسی نمایشی علمی سرگرمی کے بجائے خاموش تدریس، دعوت اور جماعتی خدمت میں گزرا۔

مولانا ابو بکر صدیق سلفی کی ولادت یکم فروری ۱۹۲۶ء کو ضلع فیروز پور کی تحصیل فیروز پور کے ایک گاؤں روڑی میں ہوئی۔ ان کا آبائی تعلق امر تسر کے قریب ایک گاؤں سنگھ پورہ سے تھا۔ ابھی کم سن تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی اور والدہ نے پرورش کی۔ گھر میں دینی ماحول موجود تھا اور والدہ کی خواہش تھی کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کرے۔ چناں چہ ابتدائی تعلیم گاؤں کے بورڈ اسکول سے حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے مختلف علاقوں میں اہلِ حدیث کے مدارس اور اکابر علما کی علمی مجالس نوجوان طلبہ کی تربیت کا اہم مرکز ہوا کرتی تھیں۔

ان کا تعلیمی سفر کئی مدارس اور جلیل القدر اساتذہ کی صحبت سے عبارت ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم مولانا شمس الدین سے حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ رحمانیہ اور دوسرے علمی مراکز میں مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں مولانا عبد العزیز پٹیالوی، مولانا حافظ محمد اسماعیل روپڑی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف

بھوجیانی اور دیگر اہلِ علم کے نام آتے ہیں؛ خصوصاً مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے ان کا تعلق محض رسمی تلمذ تک محدود و نہ رہا بلکہ آگے چل کر علمی و تدریسی زندگی میں بھی یہ نسبت قائم رہی۔

ان کی تدریسی زندگی مختلف مدارس سے وابستہ رہی قیامِ پاکستان کے بعد ان کی زندگی کا بڑا حصہ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں علمی و دعوتی سرگرمیوں میں گزرا۔ کچھ عرصہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے وابستہ رہے۔ بعد میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی قائم کردہ درس گاہ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔

ان کے علمی سفر کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ انھیں ایسے اکابر کی صحبت میسر آئی جو پاکستان میں حدیث کی تدریس و تحقیق کے بڑے نام تھے۔ اسی ماحول نے ان کے مزاج میں کتاب و سنت سے وابستگی کے ساتھ درس و تدریس اور جماعتی خدمت کا ذوق پیدا کیا۔ ان کی دعوتی زندگی بھی خاصی وسیع تھی۔ مختلف علاقوں میں خطابت، وعظ اور درس کے ذریعے کتاب و سنت کی دعوت پہنچاتے رہے۔ اور ایک عرصے تک مسجد نجم اہلِ حدیث، لاہور میں بھی تعلیم و تدریس اور دینی خدمت انجام دیتے رہے۔

مولانا سلفی کی زندگی کا دوسرا نمایاں رخ ان کی جماعتی وابستگی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد طلبۂ اہلِ حدیث کو منظم کرنے کے لیے قائم ہونے والی "جمعیت طلبہ اہلِ حدیث" کے وہ بانی ارکان میں شامل تھے اور اس کے پہلے نائب صدر منتخب ہوئے۔ یوں ان کی جماعتی و تنظیمی زندگی کا آغاز عہدِ شباب ہی میں ہو گیا تھا۔ بعد کے عشروں میں بھی وہ جماعتی اداروں، مدارس اور مساجد میں مختلف حیثیتوں میں کام کرتے رہے۔ عمر کے آخری دور میں وہ ہفت روزہ الاعتصام جیسے تاریخی جماعتی و علمی جریدے کے سرپرست تھے۔

تحریر و تصنیف سے بھی انھیں مناسبت تھی؛ اگرچہ ان کی اصل شناخت مصنف سے زیادہ مدرس، داعی اور جماعتی خادم کی رہی۔ انھوں نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کی معروف کتاب کشف الشبہات کا اردو ترجمہ کیا جو شائع ہو کر مقبول ہوا۔ دینی اور جماعتی جرائد میں وہ متفرق موضوعات پر لکھتے رہے۔

مولانا ابو بکر صدیق سلفی قدیم اہلِ حدیث علمی روایت اور پاکستان کے بعد کی جماعتی زندگی کے درمیان ایک زندہ واسطہ تھے۔ انھوں نے ان اساتذہ سے کسبِ فیض کیا جن کے نام بیسویں صدی کی اہلِ حدیث علمی تاریخ کے نمایاں ابواب ہیں؛ پھر خود نصف صدی سے زیادہ عرصے تک تدریس، دعوت اور جماعتی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کی طویل عمر میں برصغیر کی تقسیم بھی آئی، ہجرت بھی، نئے مدارس اور جماعتی اداروں کی تشکیل بھی ہوئی اور دعوت و ابلاغ کے ذرائع بھی یک سر بدل گئے مگر کتاب و سنت سے ان کی نسبت اور جماعتی خدمت کا رشتہ قائم رہا۔

ایسی شخصیات عموماً بڑی تصانیف یا بلند مناصب سے زیادہ تسلسلِ روایت کی وجہ سے اہم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اساتذہ سے جو کچھ پاتی ہیں، اسے اگلی نسل کے سپرد کر کے رخصت ہوتی ہیں۔ مولانا ابو بکر صدیق سلفی رحمہ اللہ بھی اکابر اہل حدیث کی اسی علمی و دعوتی امانت کے امین تھے۔ ان کی وفات سے جماعت ایک ایسے بزرگ سے محروم ہو گئی جس کی یادوں میں اہل حدیث کی قریب ایک صدی کی علمی، دعوتی اور تنظیمی تاریخ سمٹ آئی تھی۔

اللہ تعالیٰ ان کی طویل علمی و دعوتی مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کے حسنات کو جاری و ساری رکھے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انھیں اپنی وسیع رحمت و مغفرت سے نوازے۔ آمین۔

محترم محمد دین بھٹی مرحوم

جامعہ لاہور الاسلامیہ کے فاضل ڈاکٹر آصف جاوید کے والدِ محترم محمد دین بھٹی ۲۵ جولائی ۲۰۲۶ء کو تقریباً نوے برس کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ

مرحوم کا تعلق ضلع فیروزپور (بھارت) کے گاؤں منڈی وال سے تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ان کا خاندان اوکاڑہ کے نواحی علاقے موضع درگن میں آباد ہوا، جہاں کاشت کاری اور گلہ بانی ان کا ذریعۂ معاش رہا۔ وہ نہایت سادہ، دیانت دار، قانع اور بے نفس انسان تھے۔ نماز، روزہ، تہجد، تلاوتِ قرآن، اعتکاف اور ذکر و عبادت ان کا معمول تھا۔ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک تلاوت اور نمازِ اشراق کی پابندی کرتے اور امام مسجد کی عدم موجودگی میں خود امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ابتدا میں اپنے ماحول کے زیرِ اثر بعض مروجہ رسوم کے قائل تھے لیکن حق واضح ہونے پر انھیں ترک کر کے کتاب و سنت کے راستے کو اختیار کر لیا۔

مرحوم کی زندگی کا ایک روشن پہلو ان کی حیا، راست بازی، حقوق العباد کی پاس داری، صبر و شکر اور غضِ بصر کی غیر معمولی کیفیت تھی۔ اولاد کی دینی تربیت کو ہمیشہ مقدم رکھا اور اسی جذبے کے تحت اپنے صاحب زادے ڈاکٹر آصف جاوید کو حفظِ قرآن کے لیے مدرسہ رحمانیہ میں داخل کرایا۔ زندگی کے آخری چند ماہ بیماری میں گزرے جن میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کو خدمت کی سعادت عطا فرمائی۔ وہ اپنی اولاد سے راضی ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے اور پس ماندگان میں چار بیٹے، دو بیٹیاں اور ایک بڑا خاندان چھوڑ گئے۔

ادارۂ محدث ڈاکٹر آصف جاوید اور ان کے تمام اہلِ خانہ سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم محمد دین بھٹی کی کامل مغفرت فرمائے اور تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

علمِ حدیث کا ایک نرم خو معلم: پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ

کچھ اساتذہ اپنی کتابوں اور تحقیقات سے یاد رہتے ہیں، کچھ اپنے درس اور علمی مجالس سے اور کچھ خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ علم کے ساتھ ان کا اخلاق بھی شاگردوں کی یادداشت کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ عبد القادر اسی قبیل کے اہلِ علم تھے۔ علمِ حدیث ان کا خاص میدان تھا؛ عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس، تحقیق و تربیت اور دعوت و ارشاد میں گزرا لیکن ان سے قریب رہنے والوں کی یادوں میں ان کا علم جتنا روشن ہے، ان کی نرم خوئی، تواضع، سادگی اور شفقت کا نقش بھی اتنا ہی گہرا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا آبائی تعلق بلتستان سے تھا۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ پہنچے، جہاں حدیث، سیرت، قرآن و تفسیر ان کے اہم تخصصات رہے۔ بعد ازاں اسلامیات و عربی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کی اور امام ابن حزم کی کتاب المحلیٰ کی روشنی میں ان کے معاشی نظریات پر عربی میں مقالہ لکھا۔ پھر ایک طویل عرصہ پنجاب یونی ورسٹی کے ادارۂ علومِ اسلامیہ سے وابستہ رہے، جہاں قرآن، حدیث، فقہ، عربی اور دعوت و ارشاد کے مضامین پڑھائے اور ایم فل و پی ایچ ڈی کے بیسیوں محققین کی علمی رہ نمائی کی۔ یوں ان کی علمی زندگی میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دینی فضا، عربی زبان و ادب کا ذوق اور جدید جامعاتی تحقیق، تینوں دھارے باہم مل گئے تھے۔

ان کا علمی دل چسپیوں کا دائرہ اگرچہ فقہ، سیرت، عربی اور اسلامی علوم کے دوسرے شعبوں تک پھیلا ہوا تھا لیکن ان کا اصلی شغف اور تخصص علمِ حدیث تھا۔ ان کی معروف کتاب اصولِ حدیث اسی میدان میں ان کی طویل تدریسی مشق کا حاصل ہے جس میں اصطلاحاتِ حدیث کے دقیق مباحث کو نسبتاً سہل اور مرتب انداز میں پیش کیا گیا۔ مصباح الحدیث میں حدیث کی حجیت اور اس سے متعلق پیدا کیے جانے والے شبہات کو موضوع بنایا جب کہ سیرتِ نبوی ﷺ پر پیغمبرِ امن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ان کی علمی دل چسپی کے ایک دوسرے پہلو کی نمایندگی کرتی ہے۔ ان کی نگرانی میں ہونے والے تحقیقی کاموں کی ایک بڑی تعداد بھی حدیث اور اس کے متعلقات سے وابستہ ہے۔ تعارضِ احادیث، مقدمۂ صحیح مسلم، برصغیر کے رجالِ حدیث اور علماے پنجاب کی خدماتِ حدیث جیسے موضوعات پر ان کے زیرِ نگرانی تحقیقات ہوئیں۔ ماہ نامہ محدث اور ادارۂ محدث کے علمی ماحول سے بھی ان کا تعلق رہا اور اس مجلے میں ان کی علمی تحریریں شایع ہوتی رہیں۔

کاتبِ سطور کا ڈاکٹر صاحب سے تعلق یونی ورسٹی کی رسمی طالب علمی سے پہلے کا تھا۔ تقریباً دو دہائیاں قبل،

جب ابھی مدرسے کی طالب علمی کا زمانہ تھا، وہ منتہی جماعتوں کو بعض مضامین پڑھانے آیا کرتے تھے اور راقم کو بھی ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہی ان سے پہلا تعارف تھا۔ بعد میں مختلف مساجد میں ان کے دروس سے استفادے کا سلسلہ جاری رہا؛ بالخصوص ان کی قیام گاہ کے قریب ایک مسجد میں ان کا درسِ حدیث ہوتا تھا۔ حدیث بیان کرتے ہوئے ان کا انداز نہایت سادہ، رواں اور دل نشیں ہوتا۔ نہ غیر ضروری خطابت، نہ علمی اصطلاحات کی نمائش؛ بات جتنی تھی، اتنی ہی وضاحت اور وقار سے سامع تک پہنچا دیتے۔

۲۰۰۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی میں ایم فل کی باقاعدہ طالب علمی شروع ہوئی تو ایک مرتبہ پھر ان سے استفادے کا موقع ملا۔ عربی زبان و ادب کا کورس انھی سے پڑھا اور بعد ازاں راقم نے اپنا ایم فل کا تحقیقی مقالہ بھی انھی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ میری اہلیہ کے ایم فل مقالے کے نگران بھی ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ یوں انھیں قریب سے دیکھنے، ان سے پڑھنے اور تحقیق کے مختلف مراحل میں ان کی رہ نمائی سے فائدہ اٹھانے کا ایک طویل موقع میسر آیا۔

اس طویل تعلق کی یادوں میں ان کی علمی قابلیت کے ساتھ سب سے نمایاں چیز ان کا اخلاقِ علم ہے۔ تکلف و تصنع سے بے نیاز، فرقہ وارانہ تنگ نظری اور مسلکی تلخی سے کوسوں دور، نہایت متواضع، منکسر المزاج اور نرم خو انسان تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اتنے طویل عرصے میں کبھی ان کی زبان سے کسی کے لیے کوئی سخت کلمہ سنا ہو یا کسی طالب علم کو درشتی سے جھڑکتے دیکھا ہو۔ اختلاف ہو، غلطی کی نشان دہی ہو یا طالب علم کے کام کی اصلاح، لہجہ وہی نرم اور شفیق رہتا۔ وہ اصلاح بھی اس طرح کرتے تھے کہ آدمی کو اپنی غلطی کا احساس تو ہو جاتا، اپنی تحقیر کا نہیں۔

تدریس میں بھی یہی وصف نمایاں تھا۔ بعض اساتذہ مشکل علم کو مزید مشکل بنا کر اپنی علمی ہیبت قائم کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ ان کے درس میں مشکل مسئلہ بھی رفتہ رفتہ اس طرح کھلتا کہ بات ذہن نشین ہو جاتی۔ ان سے پڑھنے والوں کے حافظے میں ان کے اسباق کے ساتھ ان کا تبسم، ان کی نرمی اور ان کی شفقت بھی محفوظ ہے۔

ریٹائرمنٹ اور عمر کے آخری مرحلے نے بھی ان کے علمی و دعوتی تعلق کو منقطع نہیں کیا۔ درسِ حدیث، علمی مجالس، تحقیقی رہ نمائی اور دینی دعوت سے حسبِ استطاعت وابستہ رہے۔ زندگی بھر حدیثِ رسول ﷺ پڑھانے والا یہ نرم خو معلم بالآخر بتاریخ ۳ مئی ۲۰۲۶ کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ استادِ گرامی ڈاکٹر حمید اللہ عبد القادر کی علمی و دعوتی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انھیں اپنی وسیع رحمت اور مغفرت سے نوازے؛ آمین۔

امیر العظیم: اخلاص ووفا کا ایک روشن استعارہ

کسی بھی دینی تحریک کی اصل قوت اس کے دستور، تنظیم یا اداروں میں نہیں بل کہ ان رجالِ حق میں ہوتی ہے جو اپنی پوری زندگی کسی ذاتی غرض، شہرت یا منفعت کے بغیر ایک بلند مقصد کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ تحریکیں عمارتوں سے نہیں، انسانوں سے زندہ رہتی ہیں اور ایسے لوگ عموماً شہرت کی روشنی سے دُور رہ کر اخلاص، استقامت اور جہدِ مسلسل سے تاریخ کا رخ موڑتے ہیں۔ امیر العظیم بھی انھی نفوسِ قدسیہ میں سے تھے جنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ جماعت اسلامی کی دعوت اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو اپنی زندگی کا حاصل بنائے رکھا۔ ان کی رحلت جماعت اسلامی کے لیے تو ایک عظیم خسارہ ہے ہی لیکن ہر اس شخص کے لیے بھی باعثِ افسوس ہے جو دین کی سربلندی کی ہر مخلصانہ کوشش کو پوری امت کا مشترک سرمایہ سمجھتا ہے۔

امیر العظیم جماعت اسلامی کے مرکزی سیکرٹری جنرل تھے مگر ان کی اصل پہچان ایک ایسے مخلص کارکن، کام یاب مربی اور مدبر منتظم کی تھی جس نے اسلامی جمعیت طلبہ سے اپنے دعوتی و تنظیمی سفر کا آغاز کیا اور پھر اسی قافلے کے ساتھ آخر دم تک وفا نبھائی۔ زمانے بدلتے رہے، قیادتیں تبدیل ہوتی رہیں، سیاسی حالات نے بھی کئی نشیب و فراز دیکھے مگر ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور نہ مقصد سے ان کی وابستگی میں کبھی کوئی فرق آیا۔ اپنے نصب العین سے ایسی استقامت اور اپنی جماعت سے ایسی بے لوث وفاداری ہر شخص کے حصے میں نہیں آتی۔

امیر العظیم کی شخصیت کا سب سے تابندہ پہلو ان کا کردار اور اخلاق تھا۔ نرم خوئی، تحمل، شائستگی، وسعتِ ظرف اور اختلاف کے باوجود تعلق کو قائم رکھنے کا سلیقہ ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ اپنی جماعت کے کارکنوں کے لیے ایک شفیق مربی تھے اور دوسرے دینی و سیاسی حلقوں میں بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے مزاج میں نہ تلخی تھی، نہ خود نمائی اور نہ منصب کا غرور۔ گفت گو کرتے تو وقار جھلکتا، اختلاف کرتے تو شائستگی دامن گیر رہتی اور دوسروں سے ملتے تو وہ اپنائیت کا احساس ساتھ لے کر اٹھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی ان کے قریب آیا، وہ ان کے منصب سے زیادہ ان کے اخلاق کا معترف ہو کر لوٹا۔

تواضع اور انکسار ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے تھے۔ جب ایک موقع پر انھیں جماعت اسلامی کے مرکزی سیکرٹری جنرل کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کے معذرت کر لی کہ وہ ابھی خود کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے۔ بعد ازاں اگرچہ انھوں نے نظم جماعت کے پیش نظر یہ ذمہ داری قبول کر لی مگر اس ایک واقعے سے ان کے مزاج کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان کے نزدیک منصب

اعزاز نہیں، امانت تھا اور عہدہ طلب کرنے کی چیز نہیں تھی بل کہ ایک بھاری ذمہ داری تھی۔ ایسے لوگ آج کم دکھائی دیتے ہیں جو منصب سے پہلے اپنی اہلیت کا محاسبہ کریں اور خدمت کو ترجیح دیں۔

امیر العظیم غیر معمولی تنظیمی بصیرت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ افراد کی تربیت، کارکنوں کی رہ نمائی اور جماعت کی تنظیمی استواری کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ ذمہ داری نبھانے کے علاوہ ذمہ دار انسان تیار کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ اسی لیے جماعت اسلامی کی کئی نسلیں ان سے فیض یاب ہوئیں، بے شمار کارکنوں نے ان کی صحبت میں تنظیمی شعور، دینی حمیت اور حسنِ کردار کا درس لیا۔ وہ کارکنوں کے لیے محض قائد نہ تھے بل کہ ایک شفیق مربی اور خیر خواہ بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جماعت میں ان کا احترام کسی عہدے کا مرہونِ منت نہیں بل کہ برسوں کی رفاقت، اعتماد، اخلاص اور بے لوث خدمت کا ثمر تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے لیکن بیماری ان کے عزم و حوصلے کو متزلزل نہ کر سکی۔ جسم روز بہ روز کم زور ہوتا گیا مگر دعوت و تحریک سے ان کا تعلق، جماعت کے معاملات میں دل چسپی اور ذمہ داریوں کا احساس آخر دم تک برقرار رہا۔ وہ حتی المقدور اپنی تنظیمی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے اور بیماری کو کبھی اپنی راہ کا عذر نہ بننے دیا۔

امیر العظیم کی ایک نمایاں خوبی ان کی وسعتِ ظرف اور اعتدال پسندی تھی۔ جماعتی وابستگی میں وہ جس قدر پختہ تھے، مزاج کے اعتبار سے اسی قدر کشادہ دل بھی تھے۔ اپنے موقف پر پورے شرحِ صدر کے ساتھ قائم رہتے مگر دوسرے دینی و فکری حلقوں کے ساتھ احترام، حسنِ تعلق اور مکالمے کی روایت کو ہمیشہ عزیز رکھتے۔ اختلاف کو وہ کش مکش کا عنوان بنانے کے بجائے باہمی تفہیم کا ذریعہ سمجھتے تھے اور دینی قوتوں کے درمیان تعاون اور اشتراک کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے تھے۔ اسی لیے مختلف مکاتبِ فکر کے علما، دینی و سیاسی شخصیات اور اہلِ قلم انھیں عزت و اعتماد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنی اسی وسعتِ نظر اور خوش اخلاقی کی بہ دولت وہ جماعت اسلامی کے حدود سے نکل کر پورے دینی حلقے کی ایک محترم اور معتمد شخصیت بن گئے تھے۔

امیر العظیم کی رحلت ایسے مردِ درویش کی رخصت ہے جس نے اپنی پوری زندگی دعوت، تنظیم اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے وقف کیے رکھی۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی گواہ ہے کہ تحریکوں کا اصل سرمایہ اخلاص، استقامت اور کردار کے وہ چراغ ہوتے ہیں جو خاموشی سے جلتے رہتے ہیں اور اپنے بعد بھی روشنی چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے: آمین۔

محترم حاجی اسد اللہ حیدر کی وفات

ریناله خورد کی معروف دینی، سماجی اور سیاسی شخصیت حاجی اسد اللہ حیدر گزشتہ دنوں وفات پاگئے؛ إنا لله و إنا إليه راجعون۔ مرحوم جامعہ لاہور الاسلامیہ کے فاضل اور معروف صاحبِ علم ڈاکٹر جواد حیدر کے والدِ گرامی تھے۔

حاجی اسد اللہ حیدر صاحب ایک دین دار، متحرک اور خدمتِ خلق کا گہرا جذبہ رکھنے والی شخصیت تھے۔ نماز کی پابندی، مسجد سے وابستگی اور دینی کاموں کی سرپرستی ان کی زندگی کے نمایاں اوصاف تھے۔ اپنے محلے کی مسجد کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے ابتدا ہی سے بھرپور حصہ لیا اور آخر عمر تک اس کی نگرانی اور آبادی سے دل چسپی رکھتے رہے۔ اپنے صاحب زادے ڈاکٹر جواد حیدر کو دینی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا اور اس راہ میں ان کی حوصلہ افزائی بھی ان کے دینی ذوق کا ایک ثمر تھا۔ ڈاکٹر جواد کے قائم کردہ تعلیمی ادارے ''الکتاب اسکول سسٹم'' کی نگرانی اور انتظامی امور میں بھی وہ آخر وقت تک سرگرم رہے۔

دینی وابستگی کے ساتھ حاجی صاحب نے سیاسی اور سماجی میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ضرورت مندوں کی دست گیری، لوگوں کے دکھ درد میں شرکت اور اجتماعی معاملات میں فعال کردار ان کا خاص وصف تھا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علما اور اہلِ علاقہ سے ان کے خوش گوار تعلقات تھے اور مسلکی وابستگی کے ساتھ ملی اتحاد اور باہمی ہم آہنگی کو ہمیشہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کی وفات پر اہلِ علاقہ کے مختلف طبقات نے جس محبت اور کثرت سے ان کے جنازے میں شرکت کی، وہ ان کی مقبولیت اور سماجی خدمات کی ایک روشن گواہی تھی۔

ان کے آخری ایام بھی ذکرِ الٰہی اور تعلق باللہ کی کیفیت میں گزرے۔ بیماری کے دوران قرآن مجید کا ذکر کرتے اور کلمہ توحید لا إله إلا الله کثرت سے پڑھتے رہے۔ ان کے آخری کلمات میں یہ معنی خیز بات بھی تھی کہ ''اصل تو إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہی ہے اور یہی ایک مومن کی زندگی کا اصل مشن ہے۔''

ادارۂ محدث حاجی اسد اللہ حیدر صاحب کی وفات پر ان کے اہلِ خانہ، بالخصوص عزیزِ گرامی ڈاکٹر جواد حیدر سے دلی تعزیت اور افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی و سماجی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے، انھیں اپنی وسیع رحمت کے سایے میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ پس ماندگان کو صبر جمیل اور ان کے صالح نقوش پر چلنے کی توفیق بخشے؛ آمین۔

ميثاقُ مكّة ... ميثاقُ الأخوّة والوحدة والوئام

من جامعة لاهور الإسلامية إلى المملكة العربية السعودية، وجمهورية باكستان الإسلامية، والجمهورية التركية، قيادةً وحكومةً وشعبًا

قال الله تعالى: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾[آل عمران: ١٠٣]

أُعبِّرُ عن نفسي ونيابةً عن جميع منسوبِي **جامعة لاهور الإسلامية** عن أسمى آيات المحبة والتقدير للمملكة العربية السعودية، وقيادتها وشعبها الكريم، وللجمهورية التركية، وقيادتها وشعبها العزيز، ولجمهورية باكستان الإسلامية، قيادةً وحكومةً وشعبًا؛ اعتزازًا بروابط الأخوّة الإسلامية، والعلاقات التاريخية، والتعاون في خدمة الإسلام والمسلمين.

ونرى في ميثاق مكة المكرمة رسالةً جامعةً ومنهجًا راسخًا في جمع كلمة المسلمين، وترسيخ الاعتدال والوسطية، وتعزيز الأخوّة والتعاون بين شعوب الأمة ودولها.

ونرجو أن يكون هذا الميثاق المبارك أساسًا لمزيد من التقارب والتعاون بين **المملكة العربية السعودية وباكستان وتركيا**، لما لها من مكانة ودور مؤثر في العالم الإسلامي، وما يجمعها من روابط الإيمان والأخوّة والمصالح المشتركة، وما يمكن أن تقدمه من جهود في خدمة قضايا الأمة وتعزيز أمنها ووحدتها.

اللهم احفظ **المملكة العربية السعودية وباكستان وتركيا** وقياداتها وشعوبها، وأدم على بلاد المسلمين الأمن والإيمان والاستقرار والازدهار، ووفّق قادتها لما فيه خير الإسلام وعز المسلمين، واجمع كلمتهم على الحق والهدى.

اللهم اجعل ميثاق مكة المكرمة ميثاق خير ووحدة واجتماع، واجعله بدايةً لمرحلة جديدة تجمع كلمة الأمة وتقدم مصلحتها، واصرف به عنها الفتن والفرقة والنزاع.

نسأل الله أن يديم بين شعوب المسلمين المحبة والأخوّة، وأن يجعل مستقبل العالم الإسلامي وحدةً وقوةً وأمنًا وازدهارًا. والله ولي التوفيق.

أ.د. حافظ عبد الرحمن مدني
رئيس جامعة لاهور الإسلامية
بجمهورية باكستان الإسلامية

www.kitabosunnat.com magazine.mohaddis.com

CPL No. 49
Vol. 57 No. 5

Monthly MUHADDIS Lahore

35866476
35866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظرانداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

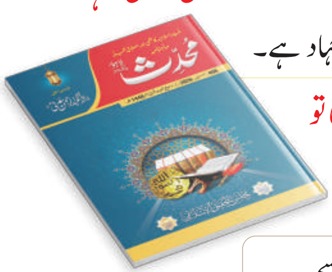

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

- قیمت فی شمارہ ۲۰۰ روپے
- زرِ سالانہ ۱۲۰۰ روپے

Designing: AK 0321-4966404